مترجم: ڈاکٹر حمزہ ابراہیم



# مرجعیت اور جمہوریت

# مرجعیت اور جمہوریت

مترجم: ڈاکٹر حمزہ ابراہیم

انتساب

ابوالاحرار

# آخوند خراسانی

کے نام

''لوگوں کے لئے حاکم کا ہونا ضروری ہے، خواہ وہ اچھا ہو یا برا، تاکہ مومن اپنے کام کر سکے اور کافر بھی بہرہ مند ہو۔ اسی کی مدد سے مال جمع ہوتا ہے اور دشمنوں سے لڑا جاتا ہے۔ راستے پر امن رہتے ہیں اور طاقتور سے کمزور کا حق دلایا جاتا ہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ 40)

# فہرست

# مقدمہ

جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک کے سب باشندے مل کر اس ملک کا نظام چلائیں اور ان کو اپنی رائے دینے میں کسی پابندی اور زور وز بردستی کا سامنا نہ ہو۔ یہ جدید دور میں ممکن ہوئی ہے، جب سائنسی ترقی نے کاغذ کی پیداوار کو عام کیا، چھاپہ خانے ایجاد ہوئے، انجن کی ایجاد سے سفر آسان ہوا اور جدید آلات کی مدد سے انسانوں میں رابطے ممکن ہوئے۔ ماضی میں کاغذ بنانا آسان نہیں تھا لہذا بیلٹ باکس کے ذریعہ ہر فرد کی رائے معلوم کرنا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح شناختی کارڈ نہیں ہوتے تھے جن سے معلوم ہو کہ کون اس ملک کا شہری ہے اور کس کی عمر دماغی بلوغت کو پہنچ چکی ہے۔ ماضی میں ہماری زندگی بہت مختلف ہوتی تھی۔ ہم قبائل کی شکل میں رہتے تھے۔ قبائل کے اپنے قوانین اور رسوم ورواج ہوتے اور سردار اپنی مرضی سے فیصلے کرتے تھے، جو چھوٹوں کی نسبت زیادہ تجربہ تو رکھتے مگر علم نہیں رکھتے تھے کیوں کہ سکول اور یونیورسٹی جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ایک علاقے میں جو کچھ ہوتا تھا اس سے دوسرے علاقے کے قبیلے ناواقف رہتے تھے اور قبائل کو اپنی فکر ہی رہا کرتی تھی۔ بادشاہ کی حکومت شہروں میں ہوتی اور شہر بھی آج کل کے قصبوں کی طرح چند لاکھ نفوس پر مشتمل ہوتے۔ کتابیں صرف اشرافیہ کو دستیاب تھیں۔ غربت، جہالت، بیماریاں اور ظلم عام تھا۔ لکھا ہوا واحد آئین نہیں ہوتا تھا اور قاضی اپنی مرضی کے مطابق فتوے دیتے اور سزائیں سناتے تھے۔ جمہوریت کی ایک اہم ضرورت لکھا ہوا آئین اور اس کی پابند عدالتوں کا قیام ہے۔ یہ بھی جدید دور میں ممکن ہوا جب آئین اور عدالتی فیصلوں کا ریکارڈ کتابی شکل میں محفوظ رکھنے، اسے ملک کے ہر گوش و کنار تک پہنچانے اور وکیلوں اور ججوں کی تعلیم کا بندوبست کرنے کے وسائل پیدا ہوئے۔ جمہوریت کی ضرورت تعلیم کا عام ہونا بھی ہے تاکہ لوگ منطقی انداز میں سوچنے کے قابل ہو سکیں اور انتخابات میں امیدواروں کی صلاحیتوں اور منصوبوں کی جانچ کر سکیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں آدھی آبادی ان پڑھ ہونے کی وجہ سے جمہوریت کمزور ہے اور قبائلی انداز غالب ہے۔ تعلیم عام ہونے کا امکان بھی پچھلے سو سال میں پیدا ہوا جب کاغذ عام ہو گیا، کاپیاں اور کتابیں بڑے

پیمانے پر شائع کرنا ممکن ہوا۔ ریل گاڑی، ہوائی جہاز اور گاڑیوں کی ایجاد نے ہی انتخابی مہم چلانے کو ممکن بنایا جس کے بغیر جمہوریت کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ جمہوریت میں معاشی، تعلیمی اور تجارتی منصوبوں پر بحث بھی ضروری ہے تاکہ لوگ خوب و بد کو پرکھ کر انتخاب کریں۔ یہ بھی جدید دور میں ممکن ہوا ہے، ماضی میں ہر فرد کی کتاب، اخبار، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ تک رسائی نہ تھی۔ بنیادی تعلیم کے بغیر فرد کی خود ارادیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جمہوریت سے مراد اکثریتی طبقے کی من مانی نہیں ہے، اگر کسی اقلیت کے اکثر لوگ کسی حکومت کو پسند نہ کرتے ہوں تو وہ مقبول حکومت نہیں کہلائے گی۔ چنانچہ جمہوریت تبھی صحت مند کہلائے گی جب ہر طبقے کی اکثریت اقتدار میں شامل ہو اور کسی نسلی، مذہبی، لسانی یا علاقائی شناخت کی بنیاد پر کسی فرد کو خاموش نہ کرایا جائے۔ بصورت دیگر اکثریتی طبقے میں سے ایک جماعت اٹھ کر فاشزم لاگو کرے گی، جو آخر میں اس اکثریتی طبقے کیلئے بھی عذاب بن جائے گا۔ اس آفت کے بارے میں پروفیسر مشل مان نے اپنی کتاب "دی ڈارک سائیڈ آف ڈیموکریسی" میں تفصیل سے تحقیق کی ہے۔ دنیا میں پہلا جمہوری انقلاب 1789ء میں فرانس میں آیا اور دوسرا 1791ء میں امریکہ میں آیا جب جنگ آزادی جیتنے کے بعد جارج واشنگٹن نے شہنشاہ بننے کے بجائے صدر بننا پسند کیا اور جمہوری طرز حکومت کو ترجیح دی۔ اس کی وجہ یورپ اور امریکہ میں چھاپہ خانے عام ہونے اور کتابوں کی اشاعت تھی اور ان انقلابات کے بعد یورپ میں جابجا جمہوری ریاستیں قائم ہونے لگیں اور بادشاہت کے دور کا خاتمہ ہوا۔ البتہ یورپ اور امریکہ میں بھی نسلی تعصب اور اکثریتی طبقے کی من مانی کا ختم ہونا تب ممکن ہوا جب تعلیم عام ہوئی اور جنگ عظیم دوم کے بعد فاشزم کی روک تھام کے قوانین تیار ہوئے۔ ایشیاء میں سب سے پہلا جمہوری انقلاب 1907ء میں ایران میں آیا اور اس کے نتیجے میں ایران کو ایک جدید ملک بنایا گیا۔ البتہ چونکہ ایران سائنسی ترقی میں مغرب سے پیچھے رہ گیا تھا لہذا روسی اور برطانوی حملوں کے سامنے ایرانی فوج شکست کھا گئی اور جمہوریت کی جگہ پہلوی آمریت نے لے لی جس کے فیصلوں کی سزا آج تک ایرانی قوم بھگت رہی ہے۔

یہ کتاب عظیم شیعہ مرجع آخوند خراسانی کی 110 ویں برسی کی مناسبت سے پیش کی جارہی ہے۔ اس کتاب میں تین مقالوں کے تراجم شامل ہیں جو جدید دور میں شیعہ مسلمانوں کے تین بڑے رہنماؤں کے سیاسی نظریات کا علمی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب اس موضوع پر بحث کا آغاز کرے گی اور صاحبان علم و فکر مزید تحقیقات انجام دیں گے۔

حمزہ ابراہیم

12 دسمبر 2021ء

# آخوند خراسانی اور ایران کی تحریکِ جمہوریت (1906ء تا 1911ء)

پروفیسر ڈینس ہرمن

(نوٹ: یہ مضمون پروفیسر ڈینس ہرمن کے مقالے Akhund Khurasani and the Iranian Constitutional Movement کا اردو ترجمہ ہے۔ حوالہ جات آن لائن انگریزی نسخے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ کتاب ''سیاست نامۂ خراسانی''، طبع دوم، تہران سنہ 2008ء کے حوالے مضمون میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔)

## تعارف

پچھلے دو عشروں میں ایران میں نہایت اہم دستاویزات شائع ہوئی ہیں جو ایران میں آئینی جمہوریت کی تحریک (1906ء۔ 1911ء) کے بارے میں علماء کے کردار کا تجزیہ کرنے اور اس سلسلے میں مزید تحقیقی کام کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مغرب میں اس تحریک پر کئے گئے مطالعات کا موضوع یا شیخ فضل اللہ نوری (متوفی 1909ء) کا کردار رہا ہے جو آئین کی حکومت کے مخالف تھے یا آیت اللہ محمّد حسین نائینی کہ جو آئینی جمہوریت کے حامی سمجھے جاتے تھے۔[1] حال ہی میں کی گئی بعض علمی تحقیقات میں ایران میں صوبائی سطح پر علماء کے کردار اور شیعہ مسلک میں نسبتاً کم پیروکار رکھنے والے فکری رجحانات مثلاً شیخی یا صوفی شیعوں کے کردار کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس تحریک میں علماء کے کردار کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔[2] 2006ء میں محسن کدیوَر صاحب نے اس زمانے میں اہل تشیع کے مرجع اعلیٰ آیت اللہ العظمیٰ محمد کاظم خراسانی (متوفی 1911ء)، المعروف بہ آخوند خراسانی، کے خطوط اور فتاویٰ کو ''سیاست نامہ خراسانی'' کے عنوان سے ایک کتاب کی شکل میں اکٹھا کر کے شائع کیا۔ ان

دستاویزات اور ان کے علاوہ آخوند خراسانی کے دوسرے آثار کی مدد سے آئینی جمہوریت کی تحریک پر ان کے نظریات کی چھاپ اور ان کے صحیح کردار کو سمجھنا ممکن ہو گیا ہے۔[3]



مرجع اعلیٰ آیت اللہ العظمیٰ محمد کاظم خراسانی (متوفی 1911ء)

آئینی تحریک کے آغاز کے وقت اصولی مجتہد آخوند خراسانی شیعی دنیا کے مرجع اعلیٰ بن چکے تھے، اور تمام مراجع میں سے ان کو سب سے بہتر مجتہد سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت اس طرح کی قیادت کو مرجعیت کے بجائے ریاست دینیہ کہا جاتا تھا۔[4] چنانچہ آخوند خراسانی کو علمائے نجف کا سردار اور اہل تشیع کا روحانی پیشوا (مقام ریاست روحانی شیعہ) کہا جاتا تھا۔[5][سیاست نامۂ خراسانی، ص32–33] دوسرے مراجع میں آیت اللہ سید محمد کاظم یزدی (متوفی 1919ء)، آیت اللہ عبد اللہ مازندرانی (متوفی 1912ء) اور آیت اللہ مرزا محمد حسین تہرانی (متوفی 1908ء) شامل تھے۔ سید کاظم یزدی کے فقہ کے دروس معروف تھے۔ ٹیلیگراف اور اخبارات کی ایجاد نے آخوند خراسانی کو وہ پہلا مرجع اعلیٰ بنا دیا کہ جو شیعہ عوام سے بلا واسطہ مخاطب ہو سکتا ہو۔ حقیقت میں تو یہ ٹیلیگراف کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا کہ ان کے پیشرو

آیت اللہ العظمیٰ میرزا سید محمدّ حسن شیرازی(متوفی1894ء)نے1891ء میں ٹالبوٹ تمباکو کمپنی کے خلاف ایرانی عوام کو کامیابی سے متحرک کیا تھا۔[6] یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ایران میں آئینی جمہوریت کی تحریک میں آخوند خراسانی کا کردار اس کو مذہبی جواز فراہم کرنا تھا، کیوں کہ وہ کبھی خود عراق کے مقدس شہروں سے اٹھ کر ایران نہیں گئے اور نہ ہی انہوں نے اپنے سیاسی افکار کو ایک کتاب یا پروگرام کی شکل میں لکھا۔[7] محسن کدیور صاحب کی شائع کردہ دستاویزات کا جائزہ لینے سے ان کے موقف کے بنیادی خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ یہ دستاویزات بنیادی طور پر اعلامیے ہیں جن میں سے بعض بہت مختصر ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور انہیں ٹیلیگراف اور دوسرے ذرائع ابلاغ کی مدد سے ایران اور عراق میں بڑے پیمانے پر نشر کیا گیا۔ تاہم ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ یہ دستاویزات مکمل نہیں ہیں اور آخوند خراسانی سے منسوب بعض چیزیں دوسری جگہوں پر ملتی ہیں جن کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

آخوند خراسانی کی حیات و خدمات اور آئینی جمہوریت کی تحریک کی نظریاتی تشکیل کرنے والے افکار کا جائزہ پیش کرنے کے بعد میں ان کے بارے میں شائع شدہ مواد میں موجود بنیادی تصورات کا ایک جائزہ پیش کروں گا۔ میری توجہ ان کے اعتدال پسند آئینی موقف، جدت پسندی اور بلند نگاہی کی سیاست، مغربی دنیا کے ساتھ پیچیدہ تعلقات اور قاجار بادشاہ سے معاملات کو سمجھنے پر ہوگی۔ چونکہ عراق میں رہتے ہوئے آخوند خراسانی نے ایران کی عملی سیاست کے اتار چڑھاؤ سے خود کو دور رکھا تھا، اس عمل نے ان کو جمہوری تحریک کے اکثر کرداروں کیلئے روحانی باپ کا درجہ دے دیا تھا۔ ان کے اس کردار کے پیش نظر میں ان کے مواضع کا دوسرے آئین نواز علماء اور خاص طور پر آیت اللہ شیخ اسماعیل محلاتی(متوفی 1924ء)اور ثقۃ الاسلام تبریزی(متوفی 1911ء) سے تقابل بھی پیش کروں گا جو ان کے نظریاتی پیرو تھے۔ آیت اللہ اسماعیل محلاتی ایک پر نفوذ عالم دین تھے جو نجف میں ہی مقیم تھے اور جیسا کہ آگے جا کر پتا چلے گا، انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کو کتابی شکل میں بھی پیش کیا۔[8] ثقۃ الاسلام تبریزی ایران کے

شہر تبریز میں شیخی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی ایک متحرک اصلاح پسند اور جمہوری شخصیت تھے اور انہوں نے سیاست کے موضوع پر متعدد کتابچے لکھے۔

آخوند خراسانی کی حیات و آثار

آخوند خراسانی 1839ء میں ایران کے شہر مشہد میں ہرات سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اسی شہر میں حاصل کی اور شادی کے بعد 1860ء میں سبزوار چلے گئے جہاں انہوں نے ملا ہادی سبزواری (متوفی 1873ء) سے قدیم فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ 1862ء میں وہ کچھ عرصہ تہران میں ملا حسین خوئی کے ہاں گزارنے کے بعد نجف چلے گئے، جہاں انہیں آیت اللہ العظمیٰ شیخ مرتضیٰ انصاری (متوفی 1864ء) کے درس میں شرکت کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد انہوں نے آیت اللہ العظمیٰ میرزا سید محمدّ حسن شیرازی کے درس میں شریک ہونا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ 1874ء میں میرزا شیرازی کے سامرا منتقل ہونے تک جاری رہا۔ اس کے بعد انہوں نے نجف میں درس دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کا اصول فقہ کا درس کافی مشہور ہوا اور 1894ء میں میرزا شیرازی کی وفات کے بعد وہ سب سے بڑے مرجع کے طور پر ابھرے۔ [9] آخوند خراسانی نے 20 دسمبر 1911ء کو سکتہ مغزی (stroke) سے وفات پائی۔ اس وقت روس نے ایران پر حملہ کر دیا تھا اور تبریز، مشہد اور تہران پر قبضہ ہو چکا تھا، اس کے نتیجے میں 24 دسمبر 1911ء کو پارلیمان تحلیل ہو گئی۔ اس صورت حال میں آخوند خراسانی نجف سے تہران جا رہے تھے کہ راستے میں وفات پا گئے۔

آخوند خراسانی کا سب سے اہم علمی کام فلسفہَ شریعت پر ان کی کتاب کفایۃ الاصول ہے جو آج تک شیعہ مدارس میں اصول فقہ کی سب سے اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ [10] اس کتاب پر کئی شیعہ مجتہدین نے شرحیں لکھی ہیں جن میں آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم خوئی کی شرح خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے مطالب کا شیخ مرتضیٰ انصاری کے نظریات سے تقابل کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب آخوند خراسانی کی مستمر

شہرت کی بنیادی وجہ بنی ہے، اور اسی وجہ سے محسن کدیور نے سیاست نامۂ خراسانی کے سرورق پر ان کے نام کے آگے ''صاحبِ کفایہ'' لکھا ہے۔ اصول فقہ میں آخوند خراسانی کے نظریات اس قدر پختہ ہیں کہ آج بھی حوزہ علمیہ کی بنیاد اس کتاب پر قائم ہے۔

آخوند خراسانی اکثر شیعہ مراجع تقلید کی دنیاوی معاملات میں احتیاط کی سیاست کا مجسم نمونہ ہیں اور اگرچہ ایسا لگتا ہے کہ وہ کبھی ایران نہیں آنا چاہتے تھے لیکن جب کبھی انہوں نے دیکھا کہ ''حسبیہ''، یعنی اخلاقی نظم کو خطرہ لاحق ہے تو ایسے نازک مواقع پر سیاسی منظر نامے پر ظاہر ہوئے۔ چنانچہ 1899ء میں انہوں نے ''شرکتِ اسلامی'' نامی تجارتی کمپنی کی حمایت کی۔ یہ ایک جدید طرز کی کپڑے کی کمپنی تھی جس کی بنیاد اصفہان کے ایک امیر تاجر حاج کازرونی (متوفی 1931ء) نے 1898ء میں شہر کے متعدد علماء کی حمایت سے رکھی تھی۔ شرکت اسلامی کا طریقہ کار، اس کا مقصد اور اہداف ایک دستور العمل کی شکل میں لکھے گئے تھے۔ اس کا ہدف تمام ایرانی تاجروں کو ایک چیمبر آف کامرس میں اکٹھا کرنا تھا تاکہ ایران میں مغربی تجارتی اداروں کے اثر و نفوذ کا مقابلہ کیا جا سکے۔ حاج کازرونی نے اپنے کام کا آغاز تاجروں کو اس بات کی طرف دعوت دینے سے کیا کہ وہ عوام میں درآمد شدہ کپڑے کے استعمال کے خلاف تشہیری مہم چلائیں۔ اس زمانے میں برطانیہ میں تیار ہونے والا کپڑا ایران میں بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اگلے مرحلے میں شرکت اسلامی نے ایران کے بڑے تاجروں کو اس بات کی طرف مائل کرنا تھا کہ وہ استعمال کی چیزیں تیار کرنے کے جدید کارخانے لگائیں تاکہ مغرب پر انحصار کم کیا جا سکے۔ اس کمپنی نے جلد ہی اپنی شاخیں تبریز اور تہران میں بھی کھول لیں، لیکن 1903ء میں دیوالیہ ہو گئی۔ [11] اس منصوبے کیلئے اپنی حمایت کی تشہیر کیلئے آخوند خراسانی نے قاہرہ سے چھپنے والے اخبار ''ثوریہ'' سے بھی مدد لی۔ [12] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 155–156] 1902ء سے 1904ء کے سالوں میں انہوں نے عتبات کے دوسرے علماء کے ہمراہ ایران کے شاہی دربار کی فضول خرچی، دربار کے بعض ارکان کی طرف سے سرکاری جائیداد کے غبن اور روس کے بڑھتے ہوئے قرضوں کے خلاف کئی خطوط روانہ کئے اور بعض وزراء کو خیانت کا

مرتکب قرار دیا۔[13][سیاست نامۂ خراسانی، ص158]انہوں نے بڑھتی ہوئی معاشی مراعات پر اعتراض کرنے کے علاوہ جوزف ناؤس پر بھی تنقید کی جو بیلجیم کا ایک سفارتکار تھا اور اسے بادشاہ کی طرف سے ایران کے کسٹمز اور ڈاک کے نظام کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، اگرچہ اس کی تجویز کردہ اصلاحات بعد میں مفید ثابت ہوئیں۔[14، 15][سیاست نامۂ خراسانی، ص162]خط و کتابت کا یہ سلسلہ 1903ء میں عین الدولہ کے وزیر اعظم بنائے جانے کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی تناؤ کے دوران چلا۔[16]اس زمانے میں مختلف گروہوں میں ایک طرح کا سیاسی اتحاد ابھرنے لگا تھا جن میں تاجر، دکان دار، مفکرین اور علماء شامل تھے۔ البتہ آخوند خراسانی نے گاہے بگاہے بادشاہ مظفر الدین شاہ قاجار(متوفی 1907ء)پر اپنے اعتماد کا اظہار بھی کیا۔[17][سیاست نامۂ خراسانی، ص159]

نجف کے باقی ایرانی علماء کی طرح، جن میں ان کے شاگرد آیت اللہ محمدؐ حسین نائینی نمایاں تھے، آخوند خراسانی عراق کے سیاسی حالات کو بھی مدِ نظر رکھتے تھے۔ بعض اوقات ان کے خطوط اور مضامین عراق یا مصر میں شائع ہونے کے بعد ایران میں پہنچتے تھے۔ انہوں نے کئی ایک مدرسے بھی قائم کئے اور کچھ جدید سکول بھی بنائے، نیز کربلا میں ایک عوامی کتب خانہ قائم کیا۔ عراق میں انہیں ابوالاحرار(آزادی خواہوں کا سرپرست) کہا جاتا تھا لیکن آئینی تحریک کی مسلسل حمایت کی وجہ سے نجف میں آیت اللہ سید کاظم یزدی کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو عتبات میں شیخ فضل اللہ نوری کے جزوی حمایتی تھے۔ آیت اللہ یزدی، جو فقہ کی ایک اہم کتاب العروۃالوثقیٰ کے مؤلف بھی ہیں، نجف کے بڑے فقہاء میں سے تھے۔ اپنے کچھ مریدوں، جیسے سید اکبر شاہ وغیرہ، اور جرائم پیشہ افراد جیسے زوکرت گینگ اور شومورت گینگ کی مدد سے انہوں نے 1907ء میں آخوند خراسانی کا نجف میں جینا مشکل کر دیا۔[18][سیاست نامۂ خراسانی، ص 20]اگرچہ وہ آخوند خراسانی کو خاموش تو نہ کرا سکے لیکن انہوں نے نجف میں ان کے اثر و رسوخ کو نقصان پہنچایا، بالخصوص اس وقت جب 1908ء میں بادشاہ نے ایران کی نوزائیدہ پارلیمنٹ پر بمباری کرائی اور جب آئین مخالف گروہوں کی مدد سے وہ تہران پر قابض ہوا تو 23 جون 1908ء میں اس نے

پارلیمان کو بند کر دیا۔[19] اس زمانے میں بہت سے لوگ موت کے خوف سے آخوند خراسانی کا ساتھ دینے سے ڈرتے تھے۔ آیت اللہ نائینی نے آیت اللہ کاظم یزدی کے ساتھیوں کو استبداد کی مذہبی شاخ قرار دیا ہے۔[20] ان مصائب کے باوجود آخوند خراسانی کو صف اول کے دوسرے مراجع، جیسے آیت اللہ عبداللہ مازندرانی اور آیت اللہ مرزا محمّد حسین تہرانی کے ساتھ ساتھ آیت اللہ اسماعیل محلاتی، آیت اللہ محمّد حسین نائینی اور شیخ مہدی مازندرانی کی حمایت حاصل رہی۔ ان کے اصول فقہ کے درس میں طلاب کی شرکت بہت زیادہ رہی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب حالات تھوڑے بہتر ہوتے تھے تو اکثر طلاب آخوند خراسانی کی حمایت بھی کیا کرتے تھے۔ آخوند خراسانی کے اکثر بیانات پر دوسرے مراجع آیت اللہ عبد اللہ مازندرانی اور آیت اللہ مرزا حسین تہرانی کے تائیدی دستخط موجود ہیں۔ بہت سے دوسرے علماء، جو علمی اعتبار سے مراجع سے کم تھے، نے بھی آیت اللہ یزدی اور آخوند خراسانی میں اختلاف ختم کرنے کی کوشش کی مگر بے سود رہی۔[21] یہاں تک کہ دوسری پارلیمان کے خاتمے کے ایام میں، جب ایرانی جمہوریت کو آذربائیجان اور خراسان میں پیش قدمی کرتی ہوئی روسی افواج سے خطرہ تھا، ایرانی عوام کو جہاد کی دعوت دینے کیلئے آیت اللہ یزدی نے باقی مراجع کے فتوے پر دستخط کرنے کے بجائے الگ سے فتویٰ دیا۔[22] [سیاست نامۂ خراسانی، ص297–301] (عرض مترجم: البتہ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ آیت اللہ کاظم یزدی سماجی حالات سے دور گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے تھے اور جب پارلیمنٹ نے آئین بنا کر منظوری کیلئے نجف بھیجا تو انہوں نے بھی باقی مراجع کے ساتھ آئین کو پڑھا تو اس میں کچھ جزوی تبدیلیوں کے بعد تائیدی دستخط کر دیئے۔ جس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ شیخ فضل اللہ نوری کے برعکس وہ جمہوریت کو کفر نہیں سمجھتے تھے اور ان کی طرف سے آخوند خراسانی کی مخالفت کی وجہ شیخ فضل اللہ نوری کا وہ پروپیگنڈا تھا جس میں لڑکیوں کے لئے سکولوں کی تعمیر کو قحبہ خانے بنانے کا منصوبہ کہنے جیسے جھوٹ شامل تھے۔)

## آخوند خراسانی کے نزدیک آئینی جمہوریت کا تصور

جیسا کہ حائری اور مارٹن نے ذکر کیا ہے، یقینی طور پر سید محمدّ طباطبائی (متوفی 1918ء) کے سوا کسی آئین کے حامی مجتہد نے جدید آئینی ریاست کی تحریک کا واضح فہم پیش نہیں کیا، اور اس سے آخوند خراسانی بھی مستثنیٰ نہیں۔ [23] جب ایران میں جمہوری تحریک شروع ہوئی تو آئین پر قائم ریاست، جسے ان دنوں ایران میں ''مشروطہ'' کہا جاتا تھا، کی تعریف میں ابہام تھا۔ سید محمدّ طباطبائی، جو تحریکِ جمہوریت کے نمائندے اور قائد تھے، کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ علماء کے ہاں آئین پسندی کا تصور ابھی اتنا واضح نہیں ہے۔ انہوں نے کہا:

''ہم نے آج تک آئین کی حکومت کا تجربہ نہیں کیا ہے، لیکن ہم نے ایسی دوسری حکومتوں کے بارے میں سنا ہے، اور وہ لوگ جو ایسے ممالک میں گئے ہیں جہاں سب کیلئے یکساں مدون شدہ قانون کی حکومت ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسی حکومت ہمارے ملک میں امن و امان اور خوشحالی لائے گی۔ اس بات نے ہمارے اندر جوش و جذبہ پیدا کر دیا ہے اور ہم اپنے ملک میں آئین کی حکومت قائم کرنے کیلئے نکل پڑے ہیں۔'' [24]

تبریز سے تعلق رکھنے والے آئینی جمہوریت کی تحریک کے ایک اور حامی، شیخی شیعہ عالم ثقۃالاسلام تبریزی، نے اپنی تحریروں میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے شہر کی مسجدوں اور انجمن ملی کے ہاں خطاب کرنے کے سلسلے کو بڑھا دیا ہے تاکہ وہ عوام کو آئینی جمہوریت کا معنی سمجھا سکیں۔ [25] اس کے نتیجے میں دوسری صف کے علماء اور اہل فکر جمہوری تحریک میں شامل ہونے لگے۔

آخوند خراسانی نے آئینی جمہوریت کے بارے کوئی رسالہ یا منشور لکھنے سے گریز کیا، لیکن انہوں نے اپنے شاگردِ خاص آیت اللہ نائینی کی کتاب ''تنبیہ الامہ و تنزیہ الملہ'' کی تائید کی۔ [26] آیت اللہ نائینی سیاست کے میدان میں کافی متحرک تھے اور آیت اللہ العظمیٰ مرزا حسن شیرازی کے نزدیک ہونے کی

وجہ سے انہوں نے تمبا کو بیچنے والی برطانوی کمپنی ٹالبوٹ کو خاص رعایت ملنے کے خلاف چلائی گئی مہم میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ 1898ء سے وہ آخوند خراسانی کے قریبی افراد میں سے تھے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ آخوند خراسانی کوئی فتویٰ یا بیان دینے سے پہلے آیت اللہ نائینی سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ [27] اپریل 1909ء کی ایک مختصر تحریر میں آخوند خراسانی نے تنبیہ الامہ و تنزیہ الملہ کو رسالۂ شریفہ کہا ہے اور اس تحریر کو آیت اللہ نائینی نے کتاب کے مقدمے میں نقل کیا ہے۔ [28] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 230] تاہم لگتا ہے کہ آخوند خراسانی نے آیت اللہ اسماعیل محلاتی کی کتاب ''اللیالی المربوطہ فی وجوب المشروطہ'' کے لکھنے میں زیادہ اہم کردار ادا کیا جو اس سے ایک سال پہلے 1908ء میں لکھی گئی۔ [29] محرم 1909ء میں آیت اللہ محلاتی نے آخوند خراسانی کے کہنے پر ایک اور کتابچہ بعنوان ''مراد از سلطنتِ مشروطہ'' لکھا۔ [30] ان دو علماء کے آخوند خراسانی سے قریبی تعلق کا پتا جولائی 1910ء کے اس خط سے بھی چلتا ہے کہ جس میں آخوند خراسانی اور آیت اللہ عبداللہ مازندرانی پارلیمنٹ میں اپنے نمائندوں کے طور پر آیت اللہ نائینی اور آیت اللہ محلاتی کے نام تجویز کرتے ہیں۔ [31] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 260] حائری نے ان دونوں حضرات کو آخوند خراسانی کی فکر کا امین کہا ہے۔ [32]

اپنی کتابوں میں آیت اللہ نائینی اور آیت اللہ محلاتی نے بڑی وضاحت کے ساتھ پارلیمان کی حمایت کی، اگرچہ ان کے طرزِ استدلال میں باریک فرق پایا جاتا ہے۔ میری رائے میں آخوند خراسانی کے آثار سے جو پیغام ملتا ہے وہ آیت اللہ محلاتی کے نظریات کے زیادہ قریب ہے۔ ان دونوں کے نزدیک صرف امام معصومؑ کی قیادت میں بننے والی حکومت ہی شرعی کہلا سکتی ہے اور وہی حکومت دینی اعتبار سے جائز ہے۔ تحریک جمہوریت کے اعتدال پسند علماء، جیسے روح اللہ نجفی اصفہانی اور ثقۃ الاسلام تبریزی، نے بھی یہی موقف اپنایا۔ [33] انہوں نے کہا:

''ایران کی بری و بحری حدود کی حفاظت اور موجودہ بادشاہت کا دفاع شرعی ذمہ داری نہیں ہے۔ آئینی جمہوریت کیلئے ہماری حمایت دراصل اسلام کے جوہر کا تحفظ کرنا ہے۔''[34]

یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کیلئے شرعی حکومت زمان و مکان سے آزاد ہوتی ہے۔

البتہ آخوند خراسانی اور آیت اللہ شیخ اسماعیل محلاتی کی تحریروں اور آثار میں اس قسم کے اعتقادی نوعیت کے سوالات کو محور نہیں بنایا گیا ہے۔[35][سیاست نامۂ خراسانی، ص214] آیت اللہ حسین نائینی کی کتاب میں البتہ امام مہدیؑ کی غیبت کے زمانے میں حکومت کی مختلف ممکنہ شکلوں کی شرعی حیثیت پر نسبتاً زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ وہ متعدد صفحات میں دو قسم کی حکومتوں میں فرق واضح کرتے ہیں: ایک طرف ظالمانہ بادشاہت اور دوسری طرف مشروط، محدود اور آئین کی پابند حکومت۔[36] اس بنیاد پر آگے چل کر وہ علماء کو بھی دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں: ایک وہ جو ظلم کی مخالفت کو مذہبی فرض سمجھتے ہیں اور دوسرے جو ان کے مخالفین ہیں اور ایسے علماء کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔[37] ایسی صورت میں سیاست سے لاتعلق رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ آیت اللہ نائینی کے مطابق ظلم کی تین بڑی اقسام ہیں: خدا کے حق میں ظلم، امام زمانؑ کے حق میں ظلم اور عوام کے حق میں ظلم۔ غیبتِ امامؑ میں ایک آئینی جمہوریت جسے عادل فقہا کی حمایت حاصل ہو وہ عوام پر ہونے والے ظلم کو روک سکتی ہے۔ آگے چل کر وہ بادشاہ کے کردار کو محدود کر کے متولی تک لے آتے ہیں، جو اپنے فیصلوں میں علماء سے تائید لینے کا پابند ہو گا۔[38] شاید آیت اللہ نائینی کیلئے اس وقت کے آئین کے آرٹیکل 35 کی یہی تشریح تھی جس کے مطابق بادشاہت عوام کی امانت ہے جو انہوں نے بادشاہ کی ذات پر اعتماد کی شکل میں اسے دی ہے۔

آخوند خراسانی اور آیت اللہ اسماعیل محلاتی کے مطابق غیر مذہبی حکومتیں دو قسم کی ہو سکتی ہیں: عادل اور ظالم۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ظلم کو دبانے اور عدل و انصاف کو قائم کرنے کیلئے کوشش کریں تاکہ

اسلام کی بنیادوں کا تحفظ ہو سکے جو مغرب کے بڑھتے قدموں سے خطرے میں تھا۔ پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا قرآنی اصول مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ [39] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 164–167، 171، 177، 182، 209، 223، 231، 244، 295، 297] چونکہ جمہوریت کی تحریک کا مقصد عدل و انصاف کو قائم کرنا ہے لہذا اس کی مخالفت امام زمانؑ سے جنگ کے مترادف ہے، [40] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 172، 187، 196، 217] اور گویا یزید کی حمایت کرنا ہے۔ [41] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 160، 196، 199، 232، 234] آخوند خراسانی اور آیت اللہ محلاتی کے نزدیک قاجار سلطنت کے طور طریقے نا قابل برداشت تھے، خصوصاً جب سے محمّد علی شاہ قاجار (متوفی 1925ء) تخت نشین ہوا تھا۔

جب اسلام کی بنیادوں کے تحفظ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور آئینی جمہوریت کی مخالفت کو امام زمانؑ سے جنگ کہا جانے لگا تو یہ مفاہیم نجف کے تینوں بڑے مراجع آخوند خراسانی، آیت اللہ مازندرانی اور آیت اللہ حسین تہرانی کے مشترکہ اعلامیوں میں جمہوریت کے دفاع میں بار بار ذکر کئے جانے لگے۔

اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ آیت اللہ نائینی نے اپنی کتاب میں قرآن و حدیث کے مفصل حوالے دیئے تھے۔ آخوند خراسانی اور آیت اللہ اسماعیل محلاتی نے آئینی جمہوریت کی مشروعیت کی بحث کرنے کے بجائے قوم کی اصلاح، تعلیمی نظام، فوج اور مالیات کو بہتر بنانے پر توجہ دی۔ آخوند خراسانی اور آیت اللہ محلاتی آئینی جمہوریت کے اسلام کے عین مطابق ہونے کو بدیہی اور آشکار حقیقت سمجھتے تھے کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ صرف ایک جمہوری سیاسی عمل ہی مسلم دنیا میں حقوق کے تحفظ اور عدل و انصاف کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے اور اس کو داخلی طور پر مضبوط کر سکتا ہے۔ اپنی کتاب لیالی المربوطہ فی وجوب المشروطہ کے پہلے حصے میں آیت اللہ محلاتی آئین کی پابند حکومت اور آمریت میں فرق کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں: وہ چیزیں جو اچھی حکومت کیلئے لازم ہیں جیسے بجٹ میں قوم کی آمدنی اور

اخراجات کا صحیح حساب رکھنا، زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک تربیت یافتہ اور جدید ہتھیاروں سے لیس فوج بنانا، قومی معیشت کو ترقی یافتہ بنانا، اور بیرون ملک رہنے والے شہریوں کے تحفظ کو یقینی بنانا، وغیرہ۔ وہ اس بات کا اضافہ بھی کرتے ہیں کہ یہ شرائط اسلام کی تعلیمات تک محدود نہیں ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں جو ان کو بھیجا گیا تھا، آیت اللہ اسماعیل محلاتی فرماتے ہیں کہ حکومتیں، چاہے وہ مسلمانوں کی ہوں یا دوسروں کی، ان میں فرق ان کے آئین کی بنیاد پر ہی کیا جا سکتا ہے:

> ''یہ دو لفظ 'آئینی' اور 'آمرانہ' محض اسم صفت ہیں جو حکومت کی مختلف اقسام کو بیان کرتے ہیں۔ اگر حکمران تمام اختیارات اپنی ذات میں اکٹھے کر لے تو اس کی حکومت آمرانہ ہے۔ دوسری طرف اگر حکمران کے اختیارات عوام کی طرف سے محدود کئے گئے ہوں تو یہ آئین کی حکومت ہے۔ اس تفریق کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کسی قوم کے شہریوں کا جو بھی مذہب ہو، چاہے وہ موحد ہوں یا مشرک، مسلمان یا کافر، ان کی حکومت یا تو آمرانہ ہو سکتی ہے یا آئین کی پابند!''[42] [آیت اللہ محلاتی، ''لیالی المربوطه فی وجوب المشروطه''، رسائلِ مشروطیت، ص520]

اس زاویئے سے دیکھا جائے تو آخوند خراسانی اور آیت اللہ محلاتی کا موقف اس دور کے بعض اصلاح پسند سنی علماء کے موقف کے نزدیک معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم مولانا خیر الدین التونسی (متوفی 1881ء) کا ذکر کر سکتے ہیں جو اپنی کتاب ''اقوم المسالک فی معرفۃ احوال الممالک'' میں لکھتے ہیں:

> ''بنیادی ضرورت اچھی حکومت ہے جس کے نتیجے میں امن، امید اور کام میں وہ مہارت پیدا ہوتی ہے جو یورپی ممالک میں نظر آتی ہے۔۔۔۔ یورپ نے یہ مقاصد اور علمی پیشرفت اور صنعت اچھے نظم و نسق سے حاصل کئے جس کی بنیاد انصاف پر مبنی سیاسی نظام پر ہے۔۔۔۔ خدا کا یہ قانون اس کے کلام میں آیا ہے کہ انصاف، اچھی مدیریت اور ایسا انتظامی ڈھانچہ

جس کی سب پابندی کرتے ہوں، دولت، آبادی اور جائیداد کی ترقی کا سبب بنتا ہے۔
[43]"

چنانچہ آئینی جمہوریت آخوند خراسانی اور آیت اللہ محلاتی کیلئے سب سے بڑھ کر ایک فلاحی حکومت ہے۔ لہٰذا وہ پارلیمانی نظام کے اسلامی جواز اور اس کے طریقہ کار پر چند سطروں سے زیادہ کچھ نہیں لکھتے۔ وہ نہ تو شوریٰ کی بحث میں پڑتے ہیں نہ ہی مقننہ کے وجود اور اسکے ڈھانچے پر کوئی رائے دیتے ہیں۔[44] البتہ دوسرے آئین پسند علماء کیلئے یہ واضح تھا کہ مقننہ اور پارلیمنٹ ایک نئے ایران کی تعمیر کریں گے۔ ایک آئین پسند عالم شیخ عبد الرسول مدنی کاشانی کی ایک تحریر کے کچھ جملے صراحت سے یہ بات بیان کرتے ہیں:

''مقننہ کلی قوانین طے کرے گی، عدلیہ ان کی روشنی میں جزئیات کی تشریح کرے گی اور انتظامیہ ان کو نافذ کرے گی۔"[45]

آخوند خراسانی اور آیت اللہ محلاتی کے لئے سب سے اہم بات یہ تھی کہ علماء اس ناگزیر تحریک کا ساتھ دیں تاکہ آئین اسلامی احکام کے مطابق بن سکے۔ وہ جب اپنے مثالی سیاسی ہدف کا ذکر کرتے تو اس کیلئے'' جمہور مسلمین'' کی اصطلاح استعمال کرتے [46] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 204، 221] اور اس طرح آیت اللہ نائینی کے برعکس علماء اور مجتہدین کو سیاست میں باقی لوگوں سے بالاتر کوئی مقام دینے کے قائل نہیں تھے (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو آخوند خراسانی کی کتاب ''حاشیۃ المکاسب'' کا باب 'ولایت الفقیہ')۔ اس معاملے میں آخوند خراسانی اجتماعی دانش کو فرد کی ذاتی زندگی کے معاملات سے الگ کر کے دیکھتے ہیں کہ جن میں مجتہد اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود آخوند خراسانی نے آئینی جمہوریت پر کوئی مستقل کتابچہ لکھنے سے گریز کیا اور اس اصول کا ذکر اپنے بیانات میں اختصار کے ساتھ کیا۔ وہ وقت

کے دھارے کے ساتھ چلنے اور پارلیمنٹ کے لئے اپنی حمایت کا اظہار صرف حفظ بنیاد اسلام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حوالے سے کرتے تھے۔

## آخوند خراسانی بطور مرکز اتفاق واعتدال

آخوند خراسانی کے متعدد خطوط اور بیانات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے معتدل اور مفاہمتی لب و لہجے کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ لب و لہجہ اس وقت بھی قائم رہتا ہے جب پارلیمان کو پہلی بار توڑا گیا اور اس وقت بھی جب اسے دوسرے بار توڑے جانے کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ اگرچہ ان مواقع پر دوسرے جمہوریت خواہ علماء، جیسے عبدالحسین لاری اور عمادالعلماء خلخالی نے تند و تیز زبان استعمال کی۔ [47] ہم ایسے کئی مواقع کی نشاندہی کر سکتے ہیں جہاں آخوند خراسانی نے نہایت محتاط اور معقول رویہ اختیار کیا۔

مثال کے طور پر 1906ء میں جب آخوند خراسانی سے سوال کیا گیا کہ کفار سے مال خریدنا کیسا ہے تو انہوں نے اس شرط کے ساتھ اس کو جائز قرار دیا جب وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی طاقت میں اضافے کا سبب نہ ہو۔ ان کی تحریروں میں ''حرام'' اور ''کفار'' جیسے الفاظ بہت کم ملتے ہیں۔ [48] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 163–164] یہ بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے حتیٰ شیخ فضل اللہ نوری کے بارے بات کرتے ہوئے بھی تہذیب کا دامن نہ چھوڑا۔ انہیں امید تھی کہ وہ شیخ نوری کو آئینی جمہوریت کی مخالفت سے باز رکھ سکیں گے۔ شیخ علی مدرس کے نام خط میں انہوں نے کہا:

ترجمہ: ''شیخ فضل اللہ نوری صاحب کیلئے ایک دوستانہ نصیحت اور ان کے لئے معافی کی سفارش

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ آپ کا خط ملا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کا حال اچھا ہے اور آپ کیلئے دل سے دعا نکلی۔ تہران کے حالات کے بارے میں جو

کچھ آپ نے میرے نام اپنے خط میں کہااور جو خطوط آپ نے دوسرے احباب کو لکھے، ان کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔

شیخ نوری نے جو سب سے الگ راستہ اختیار کیا ہے وہ بے محل ہے اور علماء کیلئے صدمے کا باعث بنا ہے اور اس نے لوگوں کو بد تمیز بنادیا ہے۔ وہ آبرو کھو چکے ہیں، اس حد تک کہ تہران کے عوام ان کو بہت برا بھلا کہہ رہے ہیں اور میرے اور باقی مراجع کے پاس دوسرے شہروں سے آنے والے خطوط میں بھی ان کے بارے ایسی ہی باتیں لکھی ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ ان کے بارے میں کوئی اقدام اٹھایا جائے تاکہ علماء کی آبرو محفوظ رہے اور عوام کے جذبات ٹھنڈے ہوں۔ میں نے ان کے نام پہلے بھی کچھ دوستانہ نصائح روانہ کئے اور دوسروں نے بھی، اگرچہ انہوں نے تہدید اور سرزنش سے بھی کام لیا۔ امید ہے کہ وہ نادم ہوں گے اور دوبارہ ہم سے آملیں گے اور اپنے مقام و مرتبے کو محفوظ رکھیں گے۔

میرے خیال میں لازم ہے کہ علماءاور پارلیمان کے اراکین ان کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیں اور ان کو اور ان کے ساتھیوں کو نرمی سے سمجھائیں، ایسا نہ ہو کہ انہیں مزید دور کر دیں۔ خدا ان کے گناہوں کو معاف کرے۔ ان حالات میں جس قدر ممکن ہو مفاہمت کی کوشش کرنا بہتر ہے۔ خدا کرے یہ مسئلہ جلد حل ہو۔ یہ معاملہ جتنا طول پکڑے گا اس قسم کا نفاق بڑھتا جائے گا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ علماءاور پارلیمنٹ اس مسئلے کے حل اور مقاصد کے حصول کیلئے ہمت سے کام لیں اور امام زمانؑ، کہ ہماری جانیں ان پر فدا ہوں، سے مدد

نصرت چاہیں۔ اس ناچیز نے بھی جہاں ذمہ داری محسوس کی، کوتاہی نہیں کی اور انشااللہ بعد میں بھی اپنی ذمہ داری سے گریز نہیں کروں گا۔ خدا آسانیاں پیدا کرے۔

بندۂ حقیر

محمد کاظم خراسانی"[49][سیاست نامۂ خراسانی، ص175–176]

البتہ بعد ازاں فروری 1908ء میں، انہوں نے شیخ فضل اللہ نوری کے اقدامات کو فساد اور حرام سے تعبیر کیا اور کچھ ہفتے بعد اس کو تہران سے نکال دینے کا حکم صادر فرمایا۔ انہوں نے مجتہدین سید محمد طباطبائی اور سید عبداللہ بہبہانی کے استفسار پر کہا:

"چون نوری مخل آسائش و مفسد است، تصرفش در امور حرام است."[50][سیاست نامۂ خراسانی، ص177–179]

ترجمہ: "نوری چونکہ فساد اور تکلیف کا موجب بنا ہوا ہے لہذا اس کا خمس استعمال کرنا حرام ہے۔"

جب سید محمد طباطبائی اور سید عبداللہ بہبہانی نے خط لکھا کہ نوری نے شاہ عبدالعظیم کے مزار میں دھرنا دے دیا ہے اور وہاں سے علماء اور جمہوریت پسندوں کے قتل عام کا فتویٰ دے کر اوباشوں کو قتل وغارت گری کی دعوت دے رہا ہے، تو آخوند خراسانی اور باقی دو مراجع نے لکھ بھیجا کہ:

"رفع اغتشاشات حادثہ و تبعید نوری را عاجلاً اعلام."[51][سیاست نامۂ خراسانی، ص 180–181]

ترجمہ: ''فسادات پر جلد قابو پاکر نوری کو شہر بدر کر دیا جائے۔''

اگرچہ نوری نے اپنے غنڈوں کی مدد سے اگست 1908ء میں نجف میں آخوند خراسانی اور ان کے ساتھیوں کو تنہا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آخوند خراسانی نے 31 جولائی 1909ء کو نوری کو سزائے موت سے بچانے کی کوشش کی، جو ناکام ہوئی۔[52] یہ ایسے وقت میں کیا جارہا تھا جب ایرانی صوبے سیستان سے تعلق رکھنے والے نوری گروپ کے مولوی علی (متوفی 1922ء) نے یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ آئینی جمہوریت کی حمایت کرنے والا شخص مرجع نہیں ہو سکتا۔[53] جمہوری تحریک کے خلاف مولوی علی کے فتوے کا متن اور لہجہ بہت افراطی ہے:

''جمہوری حکومت کافر ہے اور اس کے حامی مرتد ہو گئے ہیں۔ ان کا مال لوٹنا اور ان کو قتل کرنا شرعاً جائز ہے۔''[54]

دوسری پارلیمنٹ قائم ہونے کے بعد پارلیمنٹ کے سپیکر سید حسن تقی زادہ (متوفی 1970ء) کی انتہا پسندانہ روش[55] کے مقابلے میں آخوند خراسانی کا لہجہ نرم ہے، حتیٰ کہ اس کو مفسد کہتے ہوئے بھی تکفیر نہیں کرتے اور صرف عہدے سے معزولی کا مطالبہ کرتے ہیں۔[56][سیاست نامۂ خراسانی، ص 257–259، 270] تقی زادہ کی جماعت، فرقہ دموکرات ایران، مجتہد سید عبداللہ بہبہانی کی 15 جولائی 1910ء کو شہادت میں ملوث سمجھی جاتی تھی۔

یہاں تک کہ آخوند خراسانی کے پارلیمنٹ کے حق میں لکھے گئے خطوط اور پارلیمنٹ قائم ہونے کے بعد بھیجے گئے مبارک باد کے پیغامات میں بھی تعادل ہے۔ وہ پارلیمنٹ کو 'مجلس محترم ملی' یا 'مجلس شورائے ملی' کہتے ہیں، اگرچہ بہت سے لوگ 'مجلس مقدس' کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔[57][سیاست نامۂ خراسانی، ص 167، 182، 186–187، 193، 259] مزید یہ کہ ان کی سفارشات ہمیشہ فصیح و بلیغ ہوتی تھیں۔ یہ خط اس کی ایک اچھی مثال ہے جو 19 اکتوبر 1908ء کو لکھا گیا:

''مکرر نوشتہ شدہ است کہ مجلس محترم ملی کہ اساسش بہ جہت رفع تعدیات استبداد و اعانۂ مظلومین است، اعانت و ہمراہی از آن بر ہمہ لازم است و مخل و مفسد و موہن بہ مخالفت آن مخالف و محاد باامام عصر عجل اللہ فرجہ است، اعاذاللہ بلادہ وعبادہ.

حرّرہ الاحقر الجانی محمد کاظم الخراسانی''

ترجمہ: ''جیسا کہ بارہا لکھا جا چکا ہے کہ قابل احترام پارلیمان کہ جس کی بنیاد آمریت کے ظلم کو ختم کرنے اور مظلوم لوگوں کی مدد کیلئے رکھی گئی ہے، اس کی مدد کرنا اور ساتھ دینا سب پر لازم ہے اور اس میں خلل ڈالنے یا کرپشن کرنے یا اس کی توہین کرنے والا امام زمان عجل اللہ فرجہ کا مخالف اور منکر ہے۔ اللہ امام مہدیؑ کے ملک اور غلاموں کو سلامت رکھے۔

بندۂ حقیر محمد کاظم خراسانی''[58][سیاست نامۂ خراسانی، ص189]

محسن کدیور صاحب کی جمع کردہ دستاویزات کے مطابق آخوند خراسانی نے تحریک جمہوریت کیلئے انقلاب کا لفظ پہلی بار 6 ستمبر 1909ء کو استعمال کیا، جب گیلان سے آنے والی کمک اور بختیاری قبائل کے لوگوں کی آمد کے بعد تہران پر جمہوریت پسندوں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔[59][سیاست نامۂ خراسانی، ص238، 239] گویا جہاں وہ اس بات سے خوش تھے کہ پارلیمنٹ کو بحال کر لیا گیا ہے وہیں ایسا ممکن ہے کہ وہ سیاسی عمل کے ہاتھ سے نکل جانے کے خدشے سے بھی دوچار ہوں۔

ان کی اعتدال پسندی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب کچھ لوگوں نے آئین میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے شامل کی گئی شقوں پر اعتراض کیا تو آخوند خراسانی نے انھیں یاد دلایا کہ یہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اقلیتوں کا تحفظ یقینی بنائیں۔ انہوں نے کہا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم. ایذاء و تحقیر طایفہ ی زردشتیہ و سایر اہل ذمہ کہ در حمایت اسلام اند حرام، و بر تمام مسلمین واجب است کہ وصایای حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ الطاہرین را در حسن سلوک و تالیف قلوب و حفظ نفوس و اعراض اموال ایشان کما ینبغی رعایت نمایند و سر موئی تخلف نکنند. ان شاء اللہ تعالیٰ

من الاحقر محمد کاظم خراسانی"

ترجمہ: "اسلام کی حمایت میں رہنے والے زرتشتیوں اور دوسرے ذمیوں کو تکلیف پہنچانا یا ان کی بے عزتی کرنا حرام ہے، اور سب مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان سے حسن سلوک، ان کی تالیف قلبی اور ان کی جان و مال کے تحفظ کے سلسلے میں حضرت خاتم النبیین ﷺ کی وصیتوں کے پابند رہیں اور بال برابر انحراف نہ کریں۔ انشاءاللہ۔

بندۂ حقیر محمد کاظم خراسانی"[60] [سیاست نامۂ خراسانی، ص226]

البتہ اس بیان کے بہت مختصر و جامع ہونے کی وجہ سے یہ اندازا لگانا تھوڑا مشکل ہے کہ وہ اقلیتوں کیلیئے آئین میں کس مقام کے قائل تھے اور کیا وہ مجتہد سید محمّد طباطبائی کی طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بنیادی انسانی برابری کے قائل تھے یا نہیں؟

تمام ماخذ قابل دسترس نہ ہونے کی وجہ سے ہنوز اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا آخوند خراسانی ہمیشہ تحریک جمہوریت کی حمایت کرتے تھے اور کیا وہ اس سلسلے میں جدوجہد کرنے والی سبھی قوتوں کے حامی تھے؟ ہم نے پہلے کسی مقام پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ذاتی ڈائری بعض اوقات بڑی مفید ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اگرچہ عوام میں ثقۃ الاسلام تبریزی آئینی جمہوریت کی تحریک کے بڑے پر جوش حامی تھے، لیکن اپنی ذاتی ڈائری میں وہ اپنے کچھ شکوک و تحفظات

لکھا کرتے تھے۔ [61] وہ خاص طور پر ستار خان اور اس کے مجاہدین کی پیدا کردہ بے نظمی سے کافی پریشان تھے۔ [62] جہاں تک آخوند خراسانی کا تعلق ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ تو بختیاری قبائل کی مدد سے اصفہان اور تہران کا فتح ہونا [63] اور نہ ہی تبریز کا ستار خان اور باقر خان کی رہنمائی میں لڑنے والے مجاہدین کے ہاتھوں میں جانا، نہ ہی غیر مسلم اقلیتوں کی طرف سے کئے جانے والے مطالبات، یہ سب عوامل اتنے اہم نہ تھے کہ آخوند خراسانی انہیں تحریک کے رخ کے تعین میں فیصلہ کن سمجھتے۔

(عرض مترجم: اہلیان ہمدان کے نام خط میں آخوند خراسانی لکھتے ہیں:
''عجبا چگونہ مسلمانان، خاصہ ی علماء ایران، ضروری مذہب امامیہ را فراموش نمودند کہ سلطنت مشروعہ آن است کہ متصدی امور عامہ ی ناس و رتق و فتق کارہای قاطبہ ی مسلمین و فیصل کافہ ی مہام بہ دست شخص معصوم و موید و منصوب و منصوص و مأمور من اللہ باشد مانند انبیاء و اولیاء (ع) و مثل خلافت امیر المومنین (ع) و ایام ظہور و رجعت حضرت حجت (ع)، و اگر حاکم مطلق معصوم نباشد، آن سلطنت غیر مشروعہ است، چنان کہ در زمان غیبت است و سلطنت غیر مشروعہ دو قسم است، عادلہ، نظیر مشروطہ کہ مباشر امور عامہ، عقلا و متدینین باشند و ظالمہ و جابرہ است، مثل آنکہ حاکم مطلق یک نفر مطلق العنان خودسر باشد. البتہ بہ صریح حکم عقل و بہ فصیح منصوصات شرع «غیر مشروعہ ی عادلہ» مقدم است بر «غیر مشروعہ ی جابرہ». و بہ تجربہ و تدقیقات صحیحہ و غوررسی ہای شافیہ مبرہن شدہ کہ نُہ عشر تعدیات دورہ ی استبداد در دورہ ی مشروطیت کمتر می شود و دفع افسد و افتح بہ فاسد و بہ قبیح واجب است. چگونہ مسلم جرأت تفوہ بہ مشروعیت سلطنت جابرہ می کند و حال آنکہ از ضروریات مذہب جعفری غاصبیت سلطنت شیعہ است.'' [سیاست نامۂ خراسانی، صفحات 214،215]
ترجمہ: ''میں حیرت زدہ ہوں کہ مسلمانوں، اور خصوصاً بعض ایرانی علماء، نے شیعہ مسلک کے اس بنیادی عقیدے کو کیسے فراموش کیا ہے جس کے مطابق شرعی طور پر حکومت کرنے، عوام کے امور کو چلانے، مسلم معاشرے کے مسائل کے حل کرنے اور اہم فیصلے کرنے کا حق صرف اور صرف معصومؑ کا ہے کہ جو اللہ کی طرف سے منصوب و منصوص و مامور و تائید یافتہ ہو، جیسا کہ انبیاؑء و اولیاؑء کے زمانے میں تھا یا امیر

المومنینؑ کی خلافت کے وقت تھا اور جیسا حضرت حجتؑ کے ظہور و رجعت کے زمانے میں ہو گا۔ اگر ولایتِ مطلقہ معصوم کے پاس نہ ہو تو یہ غیر شرعی بادشاہت ہو گی۔ چونکہ یہ غیبت کا زمانہ ہے تو یہاں دو قسم کی غیر شرعی حکومتیں ہو سکتی ہیں: پہلی انصاف پر مبنی جمہوریت کہ جس میں عوام کے معاملات متعدد دین دار عقلمندوں کے ہاتھ میں ہوں، اور دوسری ظلم و جبر کی حکومت جس میں ایک خود سر شخص ولیٔ مطلق بن بیٹھے۔ پس عقل اور شرعی نصوص کے اعتبار سے غیر شرعی حکومتوں میں جو عادلانہ ہو اسے ظالمانہ حکومت پر برتری حاصل ہو گی۔ انسانی تجربے اور دقیق اور تسلی بخش غور و فکر سے واضح ہو چکا ہے کہ جمہوریت استبداد کے ظلم میں کمی لاتی ہے اور کمتر برائی کو زیادہ برائی پر فوقیت دینا واجب ہے۔ ایک مسلمان کیسے جابر سلطان کی حکومت کو شرعی کہنے کی جرات کر سکتا ہے جبکہ سلطنت کو غصب شدہ سمجھنا مذہبِ جعفری کی ضروریات میں سے ہے؟'')

## آخوند خراسانی بطور مرجع

آخوند خراسانی کا نسبتاً معتدل رویہ دو عوامل کی بنیاد پر قابلِ توجیہ ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کئی سالوں سے نجف میں رہ رہے تھے اور ایران کے واقعات کے عینی شاہد نہ تھے۔ ایران کے بادشاہ محمد علی شاہ قاجار اور شیخ فضل اللہ نوری، دونوں نے ان کے خلاف اس نکتے کو اٹھایا کہ اس بنیاد پر وہ ایران کے سیاسی معاملات پر رائے دینے کے اہل نہیں ہیں۔ [64] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 191–194] دوسری وجہ جو اس سے بھی اہم ہے یہ ہے کہ آخوند خراسانی اہل تشیع کے سب سے بڑے مرجع تقلید تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے ایسا توافق پیدا کرنے والا بیانیہ ترتیب دینے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں جمہوری قوتوں میں اتحاد قائم ہو اور جو اختلاف پیدا کرنے کا سبب نہ بنے۔ جس چیز کو اولیت حاصل تھی یہ تھی کہ وہ شرعی ذمہ داری کا تعین کرنے والی قوت تھے، ایسا شخص جو ایران کے ہر علاقے میں آئین کے حامیوں میں سے کچھ کی تائید کر کے انہیں ہم وطنوں کی نگاہ میں معتبر بنا سکتا تھا۔

عتبات کے علماء، اور خاص طور پر مرجع اعلیٰ، کو ایرانی عوام اور بالخصوص عام مولویوں میں دیانت داری کا نمونہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی بات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ثقۃالاسلام تبریزی کے بیانات اس نکتے کی وضاحت کرتے ہیں کہ نجف کے مراجع اور بالخصوص آخوند خراسانی کے گرد کس قسم کا تقدس کا ہالہ موجود تھا۔ ثقۃالاسلام تبریزی جہاں ایران کے عام مولویوں پر تنقید کرتے ہیں وہیں عتبات کے علماء کو کامل انسان قرار دیتے ہیں۔ وہ علماء کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں: پہلے وہ قابل اعتماد اور فساد سے پاک لوگ جن کی تعداد بہت کم ہے اور دوسرے وہ جاہل مولوی جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پہلے گروہ میں وہ لوگ ہیں جنہیں وہ حجج اسلامِ عتبات کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اپنی کتاب ''لالان'' میں وہ ان کیلئے آیت اللہ کا لقب بھی استعمال کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ سادہ ملا ہیں جو ایران میں رہتے ہیں، ان کیلئے وہ بہت تلخ لہجہ استعمال کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ ثقۃالاسلام تبریزی یہ سمجھتے ہیں کہ مومنین کو فقہی مسائل کے علاوہ سیاسی مسائل میں بھی نجف کے مراجع کی پیروی کرنی چاہئیے۔ وہ اس نکتے کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''جسے اپنے نفس پر قابو ہے، جو اپنے ایمان کی حفاظت کرتا ہے، ذاتی خواہشات کی پیروی کے بجائے مولا کی اطاعت کرتا ہے، وہی اس قابل ہے کہ عوام اس کو اپنے لئے معیار قرار دیں۔ [65]''

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

''ہم نے بھی، ہم جمہوریت پسند لوگوں نے مراجع کی اطاعت میں سر تسلیم خم کر لیا ہے۔'' [66]

نجف کے بزرگ فقہا کی اطاعت ثقۃالاسلام تبریزی سمیت بہت سے لوگوں کی نظر میں واجب تھی۔ اس موضوع پر انہوں نے کہا:

''امامؑ کی غیبت میں ہم صراحت سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی بنیادوں کا تحفظ ممکن نہیں مگر یہ کہ اس آب و خاک کا تحفظ کیا جائے جسے ہم مادرِ وطن کہتے ہیں۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اس ظاہری طاقت (مرجعیت) سے مدد لیں، جیسا کہ اب تک کیا گیا ہے۔ [67]''



(دائیں سے بائیں) آیت اللہ مازندرانی، آیت اللہ تہرانی اور آخوند خراسانی

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

''آیئے اس مفروضے پر بات کرتے ہیں کہ آئین شریعت سے متصادم ہے۔ اس قسم کے تمام دعوے بے بنیاد ہیں کیوں کہ عتبات کے حجج اسلام، جو آج تمام شیعوں کے مرجع و ملجا

ہیں، نے آئینی جمہوریت کے لزوم میں بڑے واضح فتوے دیئے ہیں۔ تحریری حمایت کے علاوہ انہوں نے عملی حمایت بھی کی ہے۔ وہ آئین کو شوکتِ اسلام کا پشتیبان سمجھتے ہیں۔''
[68]

بہت سے دوسرے قانون کی حکومت کے حامی علماء کی طرح ثقۃ الاسلام تبریزی بھی پارلیمنٹ کے قوانین کی توثیق کیلئے تہران کے پانچ مجتہدوں کی کمیٹی بنانے کے خلاف تھے۔ان کے مطابق:

''ہمیں ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیئے جنہیں سب قبول کرتے ہوں اور جن کے پاس سب کے اعتماد کی طاقت ہو۔ یہ لطیف معاملات عتبات کے سپرد کرنے چاہئیں اور وہاں موجود شخصیات جو کہیں وہ ہر ایرانی قبول کرے گا۔۔ ۔ آج عوام کے نمائندے اپنی نمائندگی کی ذمہ داریوں کے بارے میں حساس ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ملکی آئین کو پانچ لوگوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے پاس اس بات کا کوئی حق نہیں کہ ہم حکومت تہران کے چار یا پانچ ملاؤں کے حوالے کر دیں۔''[69]

ساتھ ہی ثقۃ الاسلام تبریزی اس بات پر بھی افسوس کرتے ہیں کہ آخوند خراسانی ایران آنے کے بجائے نجف میں رکنا زیادہ پسند کرتے ہیں:

''عتبات کے حجج اسلام کا مقصد بد نظمی، ظلم، وسائل کے ضیاع اور قومی اضطراب کو روکنا ہے، انہیں نہ تو دولت کا لالچ ہے نہ ہی اقتدار کی ہوس، ان کا دامن ہر دھبے سے پاک ہے۔ اب جو مصائب یہاں ہمیں در پیش ہیں ان کا انہیں پوری طرح ادراک نہیں ہو پاتا تو اس کی وجوہات صاف ظاہر ہیں: وہ دار الحکومت سے دور ہیں اور ان تک کم خبریں پہنچتی ہیں۔''
[70]

یہ بات قابل فہم ہے کہ یہ جذبات قانون کی حکومت چاہنے والے اکثر لوگوں میں پائے جاتے تھے جو نجف کے مراجع کی طرف سے زیادہ بڑے کردار کی امید رکھتے تھے۔ بظاہر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز پر تہران میں بارہ ایسے علماء تھے جنہیں مجتہد سمجھا جاسکتا تھا۔ ان بارہ میں شیخ فضل اللہ نوری واحد شخص تھا جو باقاعدگی سے درس بھی دیتا تھا۔ [71] شہر کے عوام عتبات کے مراجع کے ساتھ ساتھ شہر کے کسی مجتہد کی بھی پیروی کرتے تھے۔ تحریکِ جمہوریت کے آغاز پر تہران میں سب سے زیادہ مقلد عمر رسیدہ مرجع آیت اللہ مرزا محمد حسین تہرانی کے تھے، [72] اور چونکہ وہ آخوند خراسانی کے بہت قریب تھے لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ 1908ء میں ان کی رحلت کے بعد تہران میں آخوند خراسانی کی تقلید نے رواج پایا۔

آخوند خراسانی نے جمہوری جدوجہد کرنے والی کئی جماعتوں اور تنظیموں کی حمایت کی، ان میں گیلان کی انجمنِ فاطمیہ، [73] تبریز کی انجمنِ ایالاتی، استنبول کی انجمنِ سادات [74] اور بوشہر کی انجمن شامل ہیں۔ [75] پارلیمنٹ کے معطل کئے جانے کے بعد جب ایران میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تو آخوند خراسانی نے جمہوری قوتوں کے نام پیغام میں کہا کہ وہ تبریز کی انجمن ایالاتی کو عارضی پارلیمان کا درجہ دے دیں۔ [76] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 216–217، 225] اس عمل سے آذربائیجان کی جمہوری تحریک کو تقویت مل سکتی تھی۔ قاجار سلطنت کے آغاز سے ہی تبریز اصلاح پسندی کی طرف سب سے زیادہ مائل تھا۔ [77] شہر کی آبادی کا تناسب، [78] اس کی نسبتاً اچھی اقتصادی حالت، [79] اس کا جغرافیائی طور پر روسی اور عثمانی سلطنتوں کے قریب ہونا، 1834ء میں محمد شاہ قاجار کی تخت نشینی سے پہلے تک اہم ممالک کے سفارت خانوں کا اس شہر میں ہونا، اور تحریکِ جمہوریت کے دوران شہر میں کچھ جدید تعلیمی اداروں کے وجود میں آنے جیسے عوامل نے دوسرے شہروں کی نسبت تبریز کو ایک غیر معمولی جگہ بنا دیا تھا۔ 9 نومبر 1908ء کو بھیجے گئے متعدد پیغامات میں بادشاہ محمّد علی شاہ قاجار کو ٹیکس دینے سے عوام کو منع کرنے کے بعد جولائی 1909ء میں آخوند خراسانی نے عوام سے کہا کہ وہ اپنا

ٹیکس تحریکِ جمہوریت سے وابستہ مقامی انجمنوں کو دیں۔[80][سیاست نامۂ خراسانی، ص 210] البتہ اس بات کا اندازا لگانا مشکل ہے کہ ان کے اس بیان پر کس قدر عمل ہوا۔

1911ء میں روس کے حملے کے بعد آخوند خراسانی نے ملک کو جہاد کیلئے تیار کرنے کیلئے بھی انجمن کی حمایت کی۔ مزید یہ کہ انہوں نے اپنے ایک قریبی فرد شیخ اسد اللہ مامقانی کو استنبول میں انجمنِ سادات سے اظہار یکجہتی کیلئے بھیجا تاکہ وہ ان کے اہداف کیلئے عتبات کے مرجع تقلید کی حمایت کا اظہار کریں۔[81]

آخوند خراسانی نے ایران کی کئی معاصر شخصیات کی حمایت بھی کی، جن میں مجتہد عبد الحسین لاری شامل ہیں،[82] جن کی حمایت کیلئے انہوں نے 1909ء میں جنوبی علاقوں کے عوام کو دعوت دی، اور مجتہد شیخ ابراہیم زنجانی کہ جو 1907ء میں پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے[83][سیاست نامۂ خراسانی، ص 170] اور جو 31 جولائی 1909ء کو شیخ فضل اللہ نوری کو قتل وفساد کے جرم میں سزائے موت سنانے والی عدالت کا حصہ تھے۔[84] شیخ زنجانی کے نام لکھا گیا آخوند خراسانی کا خط، جو شائع بھی ہوا، کافی دلچسپ ہے۔ آخوند خراسانی نے انہیں انتخاب جیتنے پر مبارک باد دی اور ملی امور میں اصلاح کیلئے ان کے مصمم ارادے کو سراہا، اور ساتھ ہی یہ کہا کہ وہ مجتہد سید محمّد طباطبائی کی اتباع کریں۔ 1911ء کے موسم گرما میں آخوند خراسانی نے متعدد گروہوں کے نام کئی خطوط لکھے۔ ان میں قبائلی سردار،[85] دوسری پارلیمان کے ارکان،[86] قزوین کے عوام،[87] اور تہران کے لوگ[88] شامل ہیں۔ اس دوران انہوں نے استر آباد کے علماء[89] کے نام بھی خط لکھا اور ملک کے تمام مدارس کے نام بھی خط لکھا جس میں انہیں آپس میں متحد رہنے کی تلقین کی[90]۔ یہ خطوط ہمیشہ مختصر ہوتے تھے جن کا مقصد تحریکِ جمہوریت کے اہداف کا ایک مختصر تعارف کروانے اور اس کو شرعی اعتبار سے جائز قرار دینے کے بعد سب سماجی گروہوں کو اس کی حمایت پر ابھارنا ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ گروہ تحریکِ جمہوریت کے مستقبل کا الگ الگ تصور رکھتے ہوں اور ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں۔ مثال کے طور پر ہم یہ

جانتے ہیں کہ جب دسمبر 1911ء میں روسی افواج اردبیل میں داخل ہوئیں تو وہاں دو سیاسی جماعتوں کے کارکنان میں تصادم ہوا۔ [91] ان میں سے ایک گروہ نعمتی نامی شخص کے زیر اثر تھا اور دوسرا حیدری نامی شخص کے زیر اثر تھا۔

آخوند خراسانی کے خطوط نہایت مختصر ہونے کے باوجود بہت اثر رکھتے تھے اور سبھی جمہوری قوتیں اپنے اقدامات کے جواز کے طور پر انہیں ہی پیش کرتی تھیں۔ ایک مثال کے طور پر بختیاری قبیلے کے رہنما سردار اسد کے ایک خط کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس وقت تک جمہوری تحریک کا ساتھ نہیں دیا جب تک عتبات کے مراجع اور خاص طور پر آخوند خراسانی کے اس اعلان کی خبر ان تک نہ پہنچی کہ آئینی جمہوریت ہی وہ واحد چیز ہے جو ایران کو مغربی تسلط سے محفوظ رکھ سکتی ہے:

> ''میں سب کو یاد دلانا چاہوں گا کہ بختیاری قبائل کے سردار حکومت اور سلطنت کے بھوکے نہیں ہیں اور اپنی زندگی سے مطمئن ہیں۔ میں علاج اور سیر و تفریح کیلئے یورپ گیا تھا لیکن دس ماہ برابر بادشاہ کے رویّے اور اس کے دربار کے بارے میں خبریں ملتی رہیں اور ایران کو بچانے کے سلسلے میں جمہوریت کے بارے میں یورپی ساتھیوں کے علاوہ مراجعِ اسلام کی نصیحتیں بھی مجھ تک پہنچیں، تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے مذہب اور وطن کیلئے جو کر سکا کروں گا، اور مجھے کوئی ڈرا نہیں سکتا نہ ہی روک سکتا ہے۔'' [92]

بختیاری سردار جو کر رہے تھے اس کی محض یہی وجہ نہ تھی کہ عتبات کے علماء نے ایک سیاسی موقف اپنایا تھا، لیکن پھر بھی اس بات کا ملاحظہ ہونا چاہیئے کہ سردار اسد اپنے اقدامات کی توجیہ کرنے کیلئے آخوند خراسانی اور ان کے حلقے کا حوالہ دینے میں نہیں ہچکچائے۔

ایران میں آخوند خراسانی کے ساتھیوں اور شاگردوں کا ایک بڑا نیٹ ورک بھی ان کی مدد کو موجود تھا۔ خراسان میں، جو ان کا آبائی علاقہ بھی تھا اور جہاں جمہوریت مخالف انجمنِ رضویہ بہت اثر و رسوخ رکھتی

تھی، آخوند خراسانی تحریکِ جمہوریت کا پلڑا بھاری کرنے میں کامیاب رہے۔ شیخ ذبیح اللہ مجتہد قوچانی (متوفی 1917ء) جو جمہوری ریاست کے حامیوں میں سے تھے، آخوند خراسانی کا شاگرد ہونے کی وجہ سے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی ایک اہم کامیابی آذربائیجان کے طلاب کو جمہوریت کی قافلے میں شامل کرنا تھی۔ شیخ ذبیح اللہ قوچانی اور سید اسد اللہ قزوینی (متوفی 1920ء)، دونوں مجتہد آیت اللہ العظمیٰ مرزا حسن شیرازی کے بھی شاگرد رہ چکے تھے، تحریک کی خبریں روزانہ امام علی رضاؑ کے حرم میں سناتے تھے، اور اسی طرح خراسان کے عوام کے مطالبات بھی پیش کیا کرتے تھے۔[93] ان دونوں حضرات کو مزید کمک فراہم کرنے کیلئے آخوند خراسانی نے 1908ء میں اپنے بیٹے مرزا محمد خراسانی (متوفی 1937ء)، المعروف مرزا آقازادہ، کو مشہد بھیجا تاکہ وہ وہاں آئینی جمہوریت کی تحریک کو قوت فراہم کریں۔ ایسا لگتا ہے کہ 23 جون 1908ء میں پارلیمنٹ کے پہلی بار معطل کئے جانے کے بعد جو مصائب جمہوری قوتوں پر ٹوٹے ان سے مرزا آقازادہ زندہ سلامت نکل آئے۔

اسی دوران اصفہان میں، جسے بختیاری قبائل نے جنوری 1909ء میں صمصام السلطنہ کی قیادت میں فتح کر لیا تھا، مذہبی رہنما آقا نجفی (متوفی 1914ء) نے آخوند خراسانی کی حمایت کا اظہار شروع کر دیا کیوں کہ ان کے خیال میں پارلیمنٹ کا احیاء ہی مغربی طاقتوں کے نفوذ سے نبٹنے کا بہترین طریقہ تھا۔[94]

## آخوند خراسانی، جدید اصلاحات اور مغرب

جیسا کہ ہم پہلے جان چکے ہیں، بنیادی طور پر آخوند خراسانی کے نزدیک تحریکِ جمہوریت کا مطلب فعال اور اچھی اصلاحات کرنے والی جدت پسند حکمرانی تھا جو بالخصوص ایران اور بالعموم مسلم دنیا کو مغرب کے تسلط سے بچا سکے۔ چنانچہ اپنی خط و کتابت میں آخوند خراسانی کبھی اپنے مخاطبیں کو یہ یاد دلانا نہ بھولے کہ ایران کو اپنی فوج اور ہتھیاروں میں جدت لانے کی کس قدر ضرورت ہے تاکہ وہ نئی قسم کی جنگ کیلئے آمادہ ہو، [95] [سیاست نامۂ خراسانی، ص186–188، 190، 252] معاشی ڈھانچے میں جدت

لانے اور خاص طور پر ایک بڑے ملی بنک کے قیام کی کس قدر ضرورت ہے، [96] [سیاست نامۂ خراسانی، ص186–187، 190] تعلیم کو عام کرنے کیلئے جدید سکول و کالج بنانا کتنا اہم ہے [97] [سیاست نامۂ خراسانی، ص204–209] اور صنعتیں اور کارخانے لگانے کی کیا اہمیت ہے۔ [98] [سیاست نامۂ خراسانی، ص252] اس ضمن میں انہوں نے امام زمانہؑ کی راہ میں جہادِ اقتصادی کی بات کی۔ [99] [سیاست نامۂ خراسانی، ص268] وہ ایرانیوں کو یہ بتانے سے بھی نہ ہچکچائے کہ سلطنتِ عثمانیہ میں بھی تجدید کی ضرورت کو محسوس کیا جارہا تھا۔ [100] انہوں نے کہا کہ جدت کی تحریک کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا تو لوگ وحشی بن کر دنیا سے پیچھے رہ جائیں گے۔ [101] [سیاست نامۂ خراسانی، ص231] انہوں نے عوام کو بتایا کہ یہ اصلاحات شرعی طور پر بھی واجب ہیں:

''متمرد از آن یا جاہل و احمق است یا معاند دین حنیف اسلام''

ترجمہ: ''(ان اصلاحات کا) مخالف یا جاہل اور بیوقوف ہے یا اسلام کا دشمن ہے۔'' [102] [سیاست نامۂ خراسانی، ص213]

اور یہ کہ:

''تہیہ اسباب استغنا از مصنوعات خارجہ و احداث کارخانجات و ترویج امتعہ داخلیہ و افتتاح مکاتب و مدارس کاملہ بہ تعلیم و تعلم علوم و صنایع محتاج الیھا، با کمال مراقبت و تحفظ بر عقائد و اخلاق و اعمال اطفال مسلمین، نہ مثل معلم خانہ ہای سابقہ کہ از روی بے انضباطی جز فساد عقائد نتیجہ نداد. تا آنکہ بوسیلۂ تعلم این علوم و صنایع کہ ہم خودش فی نفسہ واجب کفایی و ہم امروزہ تحفظ حوزہ بیضۂ اسلام بر آن متوقف و لہذا از اہم واجبات است، دین و دنیای مسلمانان محفوظ و از چنگال اعادی متخلص شوند.''

ترجمہ: ''خارجی مصنوعات کی ضرورت سے آزاد ہونے کے اسباب، کارخانوں کا قیام، مقامی مصنوعات کی ترویج، مسلمان بچوں کے عقائد اور اخلاق کے تحفظ کا خاص اہتمام کرتے ہوئے سکولوں اور کالجز کا قیام کہ جن میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم دی جائے، ایسا نہ ہو کہ جیسے پہلے زمانے میں اتالیق گھر پڑھانے آتا تھا اور اس کی کام چوری اور بے راہروی کی وجہ سے بچوں کی سوچ پر برے اثرات پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا، تاکہ ان علوم اور صنایع کی تعلیم، کہ جو نہ صرف فی نفسہٖ واجب کفایی ہے بلکہ آج اسلام کا تحفظ اس پر منحصر ہے اور یوں یہ باقی واجبات پر مقدم ہے، کی بدولت مسلمانوں کے دین و دنیا محفوظ ہو جائیں اور دشمنوں کے چنگل سے آزاد ہو جائیں۔''[103] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 205–206، 244]

اسلامی اخلاق و عقائد کے سائے میں جدید سائنس کی تعلیم دینے والے اداروں کا قیام آخوند خراسانی کی نظر میں ہنگامی عجلت کا معاملہ تھا۔[104] یہاں ممکن ہے وہ مسیحی مشنری سکولوں کے اثرات سے بھی پریشان ہوں کہ جن پر انہوں نے کئی مواقع پر بھی تنقید کی ہے۔ ممکن ہے وہ 1851ء میں قائم ہونے والے دار الفنون جیسے اداروں کی طرف اشارہ کر رہے ہوں جس کا منصوبہ بنانے اور اسے قائم کرنے کا سہرا ایران کے روشن خیال وزیر اعظم امیر کبیر (متوفی 1852ء) کے سر ہے۔

مغربی علوم کی ایسی واضح حمایت کے سلسلے میں آخوند خراسانی کا موقف ثقۃ الاسلام تبریزی کے موقف سے قابل مقایسہ ہے:

''کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ مخالفین جیسی ہی مادی اور اخلاقی قوت فراہم کی جائے؟ جیسا کہ آیہ مقدسہ میں کہا گیا ہے: وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل، [105] اس وقت یہی چیزیں دشمن کے تسلط اور نفوذ میں اضافے کا سبب ہیں۔ کیا سکول قائم کرنا لازم

نہیں؟ جیسا کہ اس آیہ شریفہ میں آیا ہے: فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم، [106] ہمیں دولت پیدا کرنی چاہیئے، روزمرہ کی زندگی کی ضروریات کیلئے ٹیکنالوجی حاصل کرنی چاہیئے، سیاسی علوم اور دوسرے علوم سیکھنے چاہئیں۔ یہ چیزیں ہمیں غیر ملکیوں پر انحصار کرنے سے نجات دیں گی۔ یہی انحصار اس کا سبب بنا ہے کہ آج مسلمانوں کے علاقوں پر کفار کا قبضہ ہے۔ لہذا ہمیں انہی طریقوں سے انہیں جواب دینا ہوگا جن کو انہوں نے ہمارے خلاف استعمال کیا ہے۔" [107]

آخوند خراسانی کی طرف سے حکمت عملی میں جدت پیدا کرنے کی مہم ان کے مغربی طاقتوں کے ساتھ پیچیدہ قسم کے تعلقات کے ہمراہ تھی۔ آخوند خراسانی ایک طرف تو یہ سمجھتے تھے کہ آئینی جمہوریت ہی ایران کو مغرب کے ممکنہ قبضے میں جانے سے بچا سکتی ہے، وہیں وہ برطانیہ کے سیاسی نظام کو ایران کیلئے مناسب سمجھتے تھے۔ کئی سالوں سے وہ روسی اور برطانوی طور طریقوں اور اہداف میں فرق کا ادراک رکھتے تھے، اور اسی طرح جرمنی اور فرانس کے سیاسی ڈھانچوں میں فرق کو بھی وہ سمجھتے تھے۔ تحریکِ جمہوریت کے آغاز سے پہلے ایران روس کا بہت زیادہ مقروض ہو چکا تھا اور یہ روس ہی تھا جس کی نظریں آذربائیجان اور خراسان پر لگی تھیں۔ آخوند خراسانی نے برطانیہ کے بارے میں ایک تدبیر سوچی۔ 1909ء کے موسم گرما میں انہوں نے بغداد میں برطانوی سفارت خانے میں سفیر سے ملنے کیلئے اپنے نمائندے بھیجے تاکہ روسی فوج کے حملے کے خلاف برطانیہ سے کمک حاصل کی جا سکے۔ [108] وہ برطانوی وفود سے ملاقات بھی کیا کرتے تھے اور کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ براؤن (متوفی 1926ء) سے بھی خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ 29 اکتوبر 1908ء میں یہ پروفیسر صاحب "پرشیا کمیٹی" کے نام سے قائم ہونے والی ایک لابی کے بانیوں میں شامل تھے جس کا مقصد سر ایڈورڈ گرے (متوفی 1933ء) کے ماتحت چلنے والے محکمۂ خارجہ پر دباؤ ڈالنا تھا کہ وہ ایران کی بابت اپنی حکمت عملی کو تبدیل کریں اور ایران میں جمہوری قوتوں کی حمایت کریں۔ [109] پرشیا کمیٹی کی سربراہی معروف تاجر

ہنری لنچ (متوفی 1913ء) کر رہے تھے اور پروفیسر ایڈورڈ براؤن اس کے نائب صدر تھے۔ پرشیا کمیٹی کے ارکان 1907ء میں برطانیہ اور روس کے درمیان ہونے والے معاہدے کے ناقد تھے جس میں ایران کے دو حصوں پر ایک دوسرے کا نفوذ مانا گیا تھا۔ کمیٹی نے ایران کی تحریکِ جمہوریت کے ان کارکنان کی بھی مدد کی جو ایران سے پناہ کی تلاش میں برطانیہ گئے اور وہاں کے عوام میں ایران کے حالات کے بارے میں شعور پھیلانا چاہا۔ پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے دسمبر 1911ء میں اپنی حکومت پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اسے تبریز میں روسی افواج کے ہاتھوں ہونے والے قتلِ عام میں برابر کا شریک ٹھہرایا۔ [110]

اگرچہ آخوند خراسانی اکثر اپنے خطوط اور تحریروں میں ان مختلف ممالک کو عموماً دول اجنبیہ، [111] یا حتیٰ کفار [112] بھی کہتے ہیں، لیکن انہوں نے رمضان 1908ء اور ربیع الاول 1910ء میں اپنے پیغامات میں ان ممالک کیلئے دول متمدنیہ، [113] دول مسیحیہ، [114] اور ملتِ نجیب اور دولتِ فخیمہ [115] جیسے القاب بھی استعمال کئے ہیں۔ ان القاب کی توجیہ وہ اس طرح کرتے ہیں کہ ان ممالک نے بہت پہلے یہ سمجھ لیا ہے کہ آزادی ایک خدائی تحفہ ہے اور اس کے حصول کی کوشش ہر انسان کا بنیادی حق ہے، جبکہ ایران میں ہمیں سابقہ بادشاہ مظفر الدین شاہ قاجار کا اس بات پر شکریہ ادا کرنا پڑا کہ اس نے ملک کو اس سمت جانے کی اجازت دی۔ [116] یہ آخری نکتہ سبھی جمہوریت پسند علماء کیلئے نہایت اہم تھا جو آزادی کے شعور کو معاشرے میں اجاگر کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور آزادی کو بے لگامی، بد نظمی اور بے دینی سے الگ کر کے سمجھانا چاہتے تھے۔ مثال کے طور پر ثقۃ الاسلام تبریزی آزادی کو خدا کے اس انعام سے تعبیر کرتے ہیں جو قرآن کے مطابق بنی اسرائیل کو دیا گیا تاکہ وہ اپنے آپ کو فرعون کے ظلم سے نجات دلا سکیں:

"یہ آزادی اس طرح کی ہے جو خالقِ مہربان نے بنی اسرائیل کو عطا کی تا کہ ان کو فرعون سے آزاد کرے۔"[117]

آخوند خراسانی کا اصلی ہدف ان ممالک، بالخصوص برطانیہ، کو اس بات کی طرف مائل کرنا تھا کہ انسانی بنیادوں پر روس کی ایران میں پیش قدمی روکنے کی کوشش کریں۔[118] لیکن 31 اگست 1907ء کے برطانیہ روس معاہدے کے بعد جو کچھ ہوا، اس سے آخوند خراسانی کی مایوسی میں اضافہ ہوتا گیا۔ 4 نومبر 1910ء کو اپنے خط میں وہ کہتے ہیں کہ برطانیہ جنوبی ایران میں اپنا تسلط اور نفوذ قائم کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے اور جمہوری قوتوں کی کوئی حقیقی مدد کرنے کے بجائے روس کی طرح کے کام ہی کر رہا ہے۔[119] اس کے کچھ دن بعد 11 نومبر 1910ء کو برطانیہ کی طرف روانہ کئے گئے خط میں انہوں نے کہا کہ کوئی ایرانی برطانیہ سے اس خیانت کی امید نہیں رکھتا تھا:

"ہر گز گمان نبود کہ آن دولت حق پرست آزادی خواہ کہ در اقطار عالم خود را معرفی بہ طرفداری از حقوق نوع بشر فرمودہ اند، مسلک قدیم و قویم خود را از دست دادہ، در محو آزادی واستقلال ایران، با دولت روس ہمدست شوند، و نظیر معاملات روس در شمال ایران را نسبت بہ جنوب ایران در صدد بر آیند."

ترجمہ: "کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ آزادی اور حق پرستی کا نعرہ بلند کرنے والا ملک کہ جو خود کو اقوام عالم میں انسانی حقوق کے حامی کے طور پر پیش کرتا ہے، اپنے قدیم اور پختہ مکتب فکر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایران کی آزادی اور استقلال کے خاتمے کیلئے روس کے ساتھ مل جائے اور جو کچھ روس ایران کے شمالی علاقوں میں کر رہا ہے وہی کچھ یہ ملک جنوبی ایران میں کرنے لگے۔"[سیاست نامۂ خراسانی، ص274]

اس سلسلے میں پروفیسر ایڈورڈ براؤن کے نام لکھے گئے خطوط کافی اہم ہیں، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ پروفیسر نے 1 جنوری 1910ء کو علماء کے نام ایک خط لکھا اور اس کے بعد ان کے اور آخوند خراسانی کے مابین پارلیمنٹ کے دوسری بار ٹوٹنے سے کچھ ماہ پہلے 1911ء کے موسم گرما تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ ان خطوط میں ایک دوسرے کو بہت احترام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ پروفیسر ایڈورڈ براؤن انہیں ''ہمارے حجۃ الاسلام'' کہہ کر پکارتے [120] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 284] اور آخوند خراسانی ان کیلئے ''حضرت العالم الفاضل'' کے القابات استعمال کرتے تھے۔ [121] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 287] ایڈورڈ براؤن اپنے خطوط میں اس بات کا یقین دلاتے کہ وہ ایران کی تحریکِ جمہوریت کے ساتھ ہیں اور یہ کہ برطانیہ میں وہ اکیلے ہی نہیں جو اس مقصد کیلئے کوشاں ہیں۔ برطانیہ کی لبرل پارٹی کے کچھ ارکان نے قیادت سے اس مسئلے پر اختلاف کر کے پرشیا کمیٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور پھر کئی مفکرین، بائیں بازو کے لوگ اور کچھ اخباروں؛ جیسے مانچسٹر گارڈین اور دی لیبر لیڈر اینڈ جسٹس؛ کے ایڈیٹرز بھی ان سے آملے۔ [122] یہ دو اخبارات لیبر پارٹی اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے داخلی دھڑوں کے نشریاتی ادارے تھے۔ 1912ء میں پرشیا کمیٹی کی طرف سے منعقد کئے گئے جلسے میں چھ ہزار افراد نے شرکت کی، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لابی کتنی قوت پکڑ چکی تھی۔ [123]

آخوند خراسانی کے نام اپنے خط میں پروفیسر ایڈورڈ براؤن امید افزا لہجے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ برطانوی حکومت مسلم دنیا کے بارے میں اپنی حکمت عملی میں اصلاح کی طرف جا رہی ہے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ خود کو ایرانی سمجھتے ہیں، اور یہ کہ ایران میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور وہ اس قوم کی تقدیر کیلئے دعاگو ہیں۔ [124] [سیاست نامۂ خراسانی، ص 318، 322] وہ ایرانیوں کی اس بات سے متفق تھے کہ ایران پر بیرونی حملے کا خطرہ منڈلا رہا ہے، لیکن وہ ایرانیوں کو اس عمل میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہ رہنے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایران میں اصلاحات کے عمل میں تیزی لانے پر زور دیتے ہیں تاکہ برطانوی فوج کو (اپنے شہریوں کے مفادات کے تحفظ کے نام پر) مداخلت

کا کوئی جواز نہ مل سکے، اور اس سلسلے میں شاہراہوں پر امن و امان کی صورت حال اور جنوبی ایران میں بختیاری قبائل اور قشقائی قبائل کے بیچ جنگوں کے ختم نہ ہونے والے سلسلے کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں:

''واضح سی بات ہے کہ جب بھی برطانوی تاجروں کے قافلے اغوا کر کے لوٹے جاتے ہیں، بالخصوص جب اس دوران کچھ لوگ مارے بھی جاتے ہیں، تو تاجر برطانوی حکومت کے ایوانوں میں اپنی بات منوانے کی کوشش کریں گے اور کسی مداخلت کی درخواست کریں گے۔ لیکن اگر ایسی چیزیں نہ ہوں تو وہ انہیں مداخلت کے جواز کے طور پر پیش نہیں کر سکیں گے۔''[125][سیاست نامۂ خراسانی، ص285]

اس ضمن میں ایڈورڈ براؤن نے یہ بھی کہا کہ ان معاملات پر کوئی ٹھوس کاروائی نہ کر سکنا ایران کے ساتھ بھی خیانت ہو گی:

''چنانچہ یہ بہت ضروری ہے کہ ایرانی قبائل کی جہالت بیرونی قوتوں کو ایسا کوئی جواز فراہم نہ کرے اور وہ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ڈاکے اور لوٹ مار کرنے والوں پر الزام آیا کرتا ہے۔ اس وقت جب ایران مشکلات میں پھنسا ہوا ہے، ایسے کام مادرِ وطن سے خیانت ہیں۔ [126]''

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

''ایران کی طاقت اور عزت اس کے اتحاد اور آئین کی اطاعت میں ہے، قانون کے نہ ہونے اور ہرج مرج میں نہیں۔''[127]

جنوری 1910ء میں وہ بھی حکومتی بجٹ میں بدانتظامی کی طرف متوجہ ہوئے، کہ یہ بھی بیرونی مداخلت کا ایک بہانہ بن سکتا تھا۔[128] آخر میں انہوں نے قوم کیلئے ذاتی مفادات کی قربانی دینے کی بات کی:

''فرد کی عظمت اس میں ہے کہ وہ اپنی ذات سے بالا تر ہو کر اپنے وطن کی بہتری کیلئے سوچ سکتا ہو۔'' [129] [سیاست نامۂ خراسانی، ص320]

ایڈورڈ براؤن کے بیانات ایران میں پڑھے جاتے تھے، جیسا کہ حزبِ دموکرات کے رکن اور ایران کے وزیرِ خارجہ حسین قلی خان نے ہنری لنچ سے وعدہ کیا کہ وہ ان سفارشات پر غور کر کے جنوبی ایران میں شاہراہوں کے امن کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گا۔

آخوند خراسانی نے ان متعدد نکات کا جواب ایک مختصر خط میں دیا جس میں ایڈورڈ براؤن کو یقین دلایا کہ انہوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے اور وہ ان سے کلی طور پر متفق ہیں اور وہ برابر ایرانیوں کو ان اصلاحات کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شیخ فضل اللہ نوری اور اس کے درباری ساتھیوں نے تحریکِ جمہوریت کے علماء اور برطانوی افراد کے بیچ خط و کتابت کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور مراجع کو مغرب کا ایجنٹ، بابی فرقے کا ایجنٹ اور اسلام کا غدار قرار دیا۔ [130]

## آخوند خراسانی اور قاجار حکمران

آخوند خراسانی سابقہ بادشاہ مظفر الدین شاہ قاجار (متوفی 3 جنوری 1907ء) کا ذکر تشکر کے ساتھ کرتے تھے۔ انہوں نے ان کے نام کئی خطوط میں اس بات کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے تحریکِ جمہوریت کی حمایت کر کے پہلی پارلیمنٹ کے قیام کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ [131] لیکن آخوند خراسانی نے ان کے نام اپنے خطوط میں دربار کی مالی خرد برد اور بیرونی قوتوں، بالخصوص روس، پر تکیہ کرنے پر تنقید بھی کی۔ آخوند خراسانی کیلئے شاہی خاندان ایک علامت کے طور پر قوم کی شناخت اور شوکتِ اسلام کے اظہار کا ذریعہ تھا۔ [132] یہ احساس بہت سے دیگر جمہوریت خواہ علماء، بالخصوص آخوند خراسانی کا ساتھ دینے والے نجف کے دوسرے مراجع اور ان کے پیروکاروں، بلکہ ایران کے اندر ثقۃ الاسلام تبریزی جیسے لوگوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ [133] ثقۃ الاسلام تبریزی نے کہا کہ چونکہ آئین کا تحفہ مظفر الدین شاہ

قاجار نے خود ہی دیا ہے تو بادشاہ کے منصب کو (علامت کے طور پر) باقی رکھنے کے سوا آئین کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے:

''مرزا حسین واعظ [134] نے کہا ہے کہ مظفر الدین شاہ قاجار نے دو نشانیاں چھوڑی ہیں، ایک آئین اور دوسری (علامتی) بادشاہت، اور دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ جو لوگ آئین کو مسترد کرتے ہیں انہیں دوسری وراثت کو بھی چھوڑنا ہوگا۔'' [135]

قاجار سلطنت میں علماء اور بادشاہ کے درمیان طاقت کی تقسیم کا ایک غیر کتبی معاہدہ تھا۔ بادشاہ کے اقتدار کو خدا یا امام زمانؑ کی طرف سے عطا کردہ طاقت سمجھا جاتا تھا، اس سے یہ سمجھ آتی ہے کہ علماء نے قاجار سلطنت کے جواز پر سوال کیوں نہیں اٹھایا۔ [136] چنانچہ صرف کچھ ہی علماء نے بادشاہت کے ادارے کو شریعت کے منافی جانا، جن میں شیخ حسین بوشہری اور عبدالحسین لاری شامل ہیں۔ [137]

تاہم آخوند خراسانی اور آخری قاجار بادشاہ محمد علی شاہ کے درمیان تعلقات جلد بگڑ گئے۔ ان کے درمیان خط و کتابت کے سلسلے کا جائزہ لینے سے ایسے لگتا ہے جیسے دونوں دوسرے کو بہرا سمجھتے ہوں، کیوں کہ ہر ایک کا کہنا ہے کہ وہ آئینی جمہوریت، وطن کے تحفظ اور اسلام کیلئے کام کر رہا ہے۔ پہلی پارلیمنٹ کے بند ہونے سے پانچ دن قبل، 18 جون 1908ء کو، بادشاہ نے کہا کہ اگرچہ وہ پوری قوت کے ساتھ پارلیمانی جمہوریت کا حامی ہے لیکن اس کیلئے ملک کی خراب حالت کو سدھارنا اور اس کا دفاع کرنا زیادہ اہم ہے، جو اس کی بنیادی ذمہ داری ہے تاکہ اس چھ ہزار سالہ سلطنت کو بچا سکے اور سب سے بڑھ کر اسلام کا دفاع کر سکے جو سیاسی جماعتوں کی دین دشمنی اور انتہا پسندوں کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس نے پسماندہ اور دور افتادہ علاقے میں بیٹھنے والے آخوند خراسانی اور ان کے ارد گرد موجود افراد کی اہلیت پر سوال اٹھاتے ہوئے کہا:

''مجھے تعجب ہے کہ آپ حضرات اسلام اور وطن کو درپیش خطرات کو کیوں سمجھ نہیں پا رہے؟''[138][سیاست نامۂ خراسانی، ص200]

جب آخوند خراسانی نے عوام سے کہا کہ اس کے اقتدار کو قبول نہ کریں اور ریاست کی اطاعت کرنا چھوڑ دیں تو بادشاہ نے تعجب کا اظہار کیا کہ 2 نومبر 1908ء کو بھیجے گئے خط میں وہ کہہ چکے تھے کہ وہ اسلام اور وطن کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔[139] کچھ دن بعد 9 نومبر 1908ء کو آخوند خراسانی نے محمد علی شاہ قاجار کی حکومت کو پہلی بار سفاک اور جابر قرار دیا اور ایرانیوں کو حکم جہاد دیتے ہوئے کہا کہ مرکزی حکومت کو ٹیکس دینا بند کر دیں:

''بہ عموم ملت ایران، حکم خدا را اعلام می داریم، الیوم ہمت در دفع این سفاک جبار، و دفاع از نفوس و اعراض و اموال مسلمین از اہم واجبات، و دادن مالیات بہ گماشتگان او از اعظم محرمات، و بذل جہد و سعی بر استقرار مشروطیت بہ منزلہ جہاد در رکاب امام زمان ارواحنا فداہ، و سر موئی مخالفت و مسامحہ بہ منزلہ خذلان و محاربہ با آن حضرت صلوات اللہ و سلامہ علیہ است. اعاذ اللہ المسلمین من ذلک. ان شا اللہ تعالیٰ

الاحقر عبداللہ المازندرانی، الاحقر محمد کاظم الخراسانی، الاحقر نجل الحاج میرزا خلیل''

ترجمہ: ''ملتِ ایران کیلئے حکمِ خدا بیان کرتے ہوئے کہنا چاہیں گے کہ آج اس سفاک و جبار کو ہٹانے کیلئے کوشش کرنا اور مسلمانوں کی جان و مال و آبرو کی حفاظت واجب ہے۔ اس کے کارندوں کو ٹیکس دینا حرام ہے۔ آئینی جمہوریت کی بحالی کیلئے جدوجہد اور کوشش امام زمانؑ، کہ ہماری جانیں ان پر فدا ہوں، کی رکاب میں جہاد کرنے کے مترادف ہے، اور اس ہدف کی مخالفت یا اس سے بال برابر انحراف آنحضرتؑ سے جنگ کرنے یا ان کا ساتھ چھوڑنے کے برابر ہے۔ خدا مسلمانوں کو اس گناہ سے بچائے۔ ان شاء اللہ

بندۂ حقیر عبد اللہ مازندرانی، بندۂ حقیر محمد کاظم خراسانی، بندۂ حقیر حاجی میرزا خلیل
"[140][سیاست نامۂ خراسانی، ص210]

وہ اس موقف پر ڈٹ گئے اور کئی مواقع پر اس کا اعادہ کیا، شاید اس وجہ سے کہ ایران میں یہ افواہ اڑا دی گئی تھی کہ ان کا فتویٰ جعلی تھا۔ [141] جمہوری قوتوں کے ایران فتح کرنے کے کچھ عرصے بعد آخوند خراسانی اور بادشاہ کے درمیان پھر خط و کتابت ہوئی۔ [142] شاہ نے زور دیا کہ وہ تو ہمیشہ سے آئینی جمہوریت کا حامی ہے اور وہ صرف اسلام دشمن قوتوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ ان خطوط میں وہ بار بار یہ کہتا ہے کہ آذربائیجان میں امن قائم ہونے کے بعد وہ پارلیمنٹ کو بحال کر دے گا۔ [143] آخر کار 18 جولائی 1909ء کو اس کو تخت سے اتار دیا گیا۔

آخوند خراسانی اور آیت اللہ عبداللہ مازندرانی نے عثمانی سلطان محمد پنجم (متوفی 1918ء) سے بھی مدد کی اپیل کی، اور اس کو مسلم دنیا کا اہم ترین سلطان بھی قرار دیا۔ عثمانی حکومت کو جائز قرار دیئے بغیر وہ اس کو قاجار حکومت سے زیادہ انصاف پسند سمجھتے تھے۔ مئی 1909ء کو لکھے گئے پیغام میں، جب ایرانی پارلیمنٹ بند تھی، انہوں نے ترک سلطان کو خلیفہ کہہ کر خطاب کیا اور اپنے دستخط میں علمائے جعفریہ لکھ کر اپنے مسلک کا اظہار بھی کیا۔ [144] عثمانی سلطان کے نام ایک اور خط میں ہمیں امیر المومنین کا خطاب بھی ملتا ہے لیکن یہ لقب بعد میں کسی نے لکھا ہے۔ [145] عتبات کے مراجع شیعی اکثریت والے ایران پر عثمانی خلیفہ کی حکومت کے خواہاں نہ تھے لیکن یہ عمل ان کا قاجار سلطنت کو رد کرنے کا ایک اظہار تھا۔ یہ بیان جمال الدین افغانی (متوفی 1897ء) کی مسلمانوں سے کئے گئے اس مطالبے کا تسلسل لگتا ہے جس میں انہوں نے سب مسلمانوں سے سلطان عبدالحمید دوم (متوفی 1909ء) کو خلیفہ تسلیم کرنے کی درخواست کی تھی۔ حمید دوم نے مسلمانوں میں اتحاد کو عثمانی سلطنت کی حکمت عملی کا ایک اہم ستون بنا لیا تھا اور اپنی سلطنت میں رہنے والے شیعوں سے مفاہمت کی راہ اپنائی تھی۔ [146]

مارچ 1910ء میں آخوند خراسانی نے نوجوان شہزادے احمد شاہ قاجار (متوفی 1930ء) کے نام عربی میں ایک خط لکھا جس میں اسے کچھ نصیحتیں کیں، جن میں زیادہ تر ملک کو جدید بنانے کے سلسلے کے جاری رہنے کی ضرورت، آئینی جمہوریت کے تحفظ، مغربی فوجی خطرے سے دفاع اور معاشرے میں عدل و انصاف کو یقینی بنانے کے بارے میں تھیں۔ انہوں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ جتنا ہو سکے عوام کا خیال رکھے۔[147][سیاست نامۂ خراسانی، ص252] 31 مئی 1910ء کو احمد شاہ قاجار کے نام لکھے گئے ایک اور مختصر خط میں آخوند خراسانی نے پھر سے اصلاحات اور ترقی پر زور دیا۔

## حاصلِ بحث

نئی سامنے آنے والی دستاویزات تک دسترس ہمارے لئے اس چیز کو ممکن بناتی ہے کہ ہم نہ صرف تحریکِ جمہوریت میں آخوند خراسانی کے کردار کو زیادہ واضح طور پر سمجھ سکیں، بلکہ مشروطہ خواہ علماء کے درمیان ظریف اختلافات کا بھی احاطہ کر سکیں۔ ان خطوط اور بیانات کے مطالعے سے جو بات قاری کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہے وہ آخوند خراسانی کے دلائل کا بہت سادہ ہونا ہے۔ قانون کے بڑے علماء کی طرح آخوند خراسانی، آیت اللہ عبد اللہ مازندرانی اور آیت اللہ میرزا محمد حسین تہرانی کی ہمراہی میں، نظریات اور سیاست کے میدان میں میانہ روی کے ساتھ داخل ہوئے اور چونکہ وہ سکوت کو ترجیح دیتے تھے، لہذا صرف اس وقت مداخلت کا فیصلہ کرتے تھے جب سماجی ضابطے (حسبیہ) کو خطرہ ہوتا تھا۔ پس آخوند خراسانی کا اصل کردار شرعی جواز کا تعین کرنے والی قوت کا تھا، جو آئین، ارکانِ پارلیمنٹ، علماء اور صوبائی تنظیموں کی حمایت کرتے ہوئے ساتھ ہی پارلیمنٹ کو مضبوط بنانے اور ملک کو جدت کے راستے پر ڈال کر مغربی تسلط سے بچنے کی ضرورت کا احساس دلاتی رہتی تھی۔


آیت اللہ اسماعیل محلاتی

نتیجتاً آخوند خراسانی نے کبھی آئین سازی کی بحث میں حصہ نہ لیا۔ ان کے بیانات کی نوعیت ہمیشہ کلی رہی اور انہوں نے اپنے قاریوں کو یہی سمجھانے کی کوشش کی کہ آئین بنانا شریعت کے مطابق ہے اور ایک پارلیمانی حکومت ہی اسلام کی بنیادوں کے تحفظ کا بہترین طریقہ اور قرآن کی اس تعلیم کے مطابق ہے کہ جس میں نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے منع کرنے کا کہا گیا ہے۔ انہوں نے شیخ فضل اللہ نوری اور دوسرے جمہوریت مخالف علماء کی طرف سے نئے سیاسی انتظام پر اٹھائے گئے اعتراضات کا کوئی جواب نہ دیا، جن میں خدا کے نازل کردہ احکام اور عوام کی منشا میں تضاد[148] کی صورت میں پیدا ہونے والا سوال اور یہ سوال کہ نئی آئینی حکومت کیلئے امورِ شریعت یا امورِ عامہ کے بارے میں قانون سازی نہ کرنا ممکن نہ ہو گا، بھی شامل ہے۔[149] کہا جاتا تھا کہ مؤخر الذکر صورت میں آئینی جمہوریت علماء کے اختیارات محدود کرے گی اور اس کیلئے امورِ عرفیہ تک محدود رہنا ممکن نہ ہو گا۔

درباری علماء کیلئے انتظامیہ کا شاہ کے ہاتھوں میں ہونا اور عدلیہ کا ان کے اپنے ہاتھوں میں ہونا ہی کافی اور ضروری تھا۔ لہذا انہیں ایسا لگا کہ مقننہ کا قیام یا تو شاہ کے اقتدار کے منافی یا پھر دین کی مخالفت ہے۔ اس موضوع پر جمہوریت مخالف عالم محمد حسین تبریزی کا جملہ نقل کیا جا سکتا ہے:

''لیکن ہم، جو اہلِ اسلام و ایمان ہیں، شریعت کے احکام کو کافی سمجھتے ہیں اور ہمیں مقننہ کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ بادشاہ اور اس کی رعیت شریعت کے مطیع ہیں۔ ہم بادشاہ کی نافرمانی کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دیں گے۔''[150]

تاہم جب بات نہ بنی تو کہنے لگے کہ پارلیمنٹ بادشاہ کی مرضی سے مذہبی گھرانوں کے افراد میں سے بنائی جائے۔ان کے مطابق پارلیمنٹ کا ہر کام علماء کی توثیق اور فتوے کے بعد ہی آگے بڑھنا چاہئیے۔20اپریل 1907ء میں شیخ فضل اللہ نوری نے یہ مشورہ دیا کہ پانچ مجتہدین کی ایک کمیٹی بنادی جائے جو پارلیمنٹ میں رائے شماری سے پہلے ہر قانون کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ وہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟اس قسم کی کونسل کے قیام کی تجویز کو ان مجتہدین نے اپنی توہین سمجھا جو انتخاب جیت کر پارلیمنٹ میں پہنچے تھے۔[151]اس کے علاوہ شیخ فضل اللہ نوری کو آئین کے آرٹیکل آٹھ اور انیس پر بھی اعتراض تھا۔ اس تحقیق میں جن دستاویزات پر کام کیا گیا ہے ان میں اس موضوع پر آخوند خراسانی کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔ آرٹیکل آٹھ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو آئین کی نگاہ میں برابر کا شہری قرار دیا گیا تھا اور آرٹیکل انیس ریاست کو اس بات کا پابند بناتا تھا کہ وہ سب کیلئے تعلیمی ادارے قائم کرے گی۔ اس سے علمائے کرام کی تعلیم پر اجارہ داری خطرے میں پڑتی تھی اور دوسرے اس سے لڑکیوں کو بھی تعلیم کے مواقع میسر آ سکتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آرٹیکل آٹھ کی مخالفت تو جمہوریت پسند مجتہد سید عبداللہ بہبہانی نے بھی کی تھی۔ آخوند خراسانی نے شیخ فضل اللہ نوری کی طرف سے پریس کی آزادی کے خلاف دیئے گئے دلائل کا بھی کوئی جواب نہیں دیا جبکہ ثقۃ الاسلام تبریزی نے کہا کہ قلم و زبان اور پریس کی آزادی کا مثبت رخ یہ ہے کہ ان کو قرانی حکم کے مطابق اچھائی کی دعوت دینے اور برائی سے منع کرنے کیلئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔[152]

واضح ہے کہ آخوند خراسانی نے جمہوریت خواہ علماء کی بھی بہت سی نظریاتی اور عملی تجاویز پر کوئی رائے دینے سے گریز کیا ہے۔ مثال کے طور پر مجتہد سید عبد الحسین لاری کا مطالبہ کہ پارلیمنٹ کے اراکین صرف مجتہدین ہونے چاہئیں اور ان کا سربراہ کسی مرجع تقلید کو ہونا چاہیئے، [153] اور عماد العلما خلخالی کی رائے کہ مقامی تنظیموں کے طریقہ کار کو شفاف بنایا جائے یا یہ کہ دو مجالس قانون ساز بنائی جائیں جن میں ایک کے ارکان عوام سے منتخب ہو کر آئیں اور ایک کے ارکان بادشاہ کی طرف سے چنے جائیں۔

بدیہی ہے کہ سب سے بڑے مرجع اور عتبات کے مجتہدوں کی بڑی تعداد کا تحریکِ جمہوریت کی غیر متزلزل حمایت کرنا ایران میں سیاسی عمل کے ارتقاء پر گہرے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ ہر پس منظر سے تعلق رکھنے والے افراد آخوند خراسانی کے فتووں کا حوالہ دیا کرتے تھے تاکہ اپنے مقصد کی مذہبی توجیہ کر سکیں۔ اگرچہ آخوند خراسانی نے نظریۂ سیاست پر کوئی کتاب نہیں لکھی، لیکن سیاسی گروہ ان کو آیت اللہ محمد حسین نائینی کے نظریات کا مؤید قرار دیتے تھے، اگرچہ جیسا کہ ہم نے واضح کیا ہے، ان کے نظریات آیت اللہ شیخ اسماعیل محلاتی کی کتاب کے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ آخوند خراسانی نے تحریکِ جمہوریت میں بڑا فعال کردار ادا کیا، ان کو مورخین نے کما حقہ جگہ نہیں دی، اس سلسلے میں ایرانی مورخین کا قصور زیادہ ہے۔ آخوند خراسانی کو ایک بڑے فقیہ اور اصولِ فقہ کی ایک اہم کتاب کے مولف سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جاتا۔ اس غفلت کی توجیہ کیلئے یہ کہنا کافی نہیں کہ انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کو ایک کتاب کی شکل میں نہیں لکھا۔ فقہا کے بیان کردہ شرعی مسائل کی تنگناؤں سے نکل کر ان کا مسلم دنیا کے بارے میں اقدامات اٹھانا؛ ان کا ایران آ کر سیاسی طاقت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے بجائے نجف میں رہنے کو ترجیح دینا؛ اور ان کا مذہبی کٹر پن سے آزاد ہونا؛ یہ سب اس بات کے اسباب میں سے ہیں کہ موجودہ دور میں اسلام کی اخوانی تعبیر کے پیروکار ان کے ذکر

سے گریز کریں۔ 1979ء کے انقلاب کے بعد اس غفلت میں اضافہ ہوا، جب آخوند خراسانی کے مخالف شیخ فضل اللہ نوری کو تحریکِ جمہوریت کے دوران مقاومت کا ہیرو بنا کر پیش کیا جانے لگا۔

# علامہ نائینی: ایک شیعہ مرجع کا نظریۂ جمہوریت

پروفیسر فرشتہ نورائی

(نوٹ: یہ مضمون پروفیسر فرشتہ نورائی کے تحقیقی مقالے The Constitutional Ideas of a Shi'ite Mujtahid: Muhammad Husain Na'ini کااردو ترجمہ ہے۔ حوالہ جات آن لائن نسخے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ کتاب ''تنبیہ الامہ و تنزیہ الملہ''، طبع سوم، تہران، سنہ 1955ء کے حوالے مضمون میں شامل کئے گئے ہیں۔)

بیسویں صدی کی ابتداء میں ایران میں اٹھنے والی تحریکِ جمہوریت میں معاشرے کے مختلف طبقات نے کردار ادا کیا تھا۔ صاحبان فکر، کاروباری حضرات اور شہری آبادی نے اس اصلاحی تحریک میں کم و بیش حصہ ڈالا۔ فطری طور پر ان کی سیاسی روش، اہداف اور مفادات مختلف تھے۔ وہ سیکولر صاحبان فکر جو مغرب کے آزاد تصورات سے متاثر تھے ایک آئین کی پابند حکومت چاہتے تھے۔ شاہی حکومت میں ایک چھوٹا اصلاح پسند گروہ بھی ان سے ہمدردی رکھتا تھا۔ حقیقت میں ان دو گروہوں میں فرق کرنا مشکل ہے کیوں کہ (اس دور میں) اکثر پڑھے لکھے افراد سرکاری ملازم ہوا کرتے تھے۔ شاید بہترین مثال مرزا ملکم خان نظام الدولہ (متوفی 1908ء) کی ہے جو ایک اصلاح پسند سرکاری افسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آزاد مفکر بھی تھے۔[1]

علمائے دین میں سے جمہوری کارکنان کے حامیوں نے قاجار شاہ کے مطلق اقتدار کو محدود کرنے کی کوشش کی اور آئین کی حکمرانی کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ وہ کسی حد تک سیکولر خیالات کے مالک تھے، لیکن ان کے بادشاہت سے اختلاف کی بنیادی وجہ سلطنت کو غصب شدہ سمجھنے کا شیعہ عقیدہ تھا۔ کاروباری طبقہ، بطور کلی آئینی جمہوریت کے حق میں تھا اور آزادی خواہوں کا ساتھ دیتا تھا، اس امید کے ساتھ کہ اصلاحات صنعت اور بنکاری کے شعبوں میں معاشی سرگرمیوں کی نئے مواقع پیدا کریں

گی۔ عوام جو صدیوں سے استبداد کی چکی میں پس رہے تھے، ایک ایسی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے جو انہیں ظلم اور جبر سے نجات دے اور شخصی اور مادی تحفظ فراہم کرے۔ ان سب گروہوں میں سے جہاں ہر ایک الگ انداز میں آئینی جمہوریت کی حمایت کرتا تھا، حریت پسند اور ترقی چاہنے والے علماء کا کردار خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔[2]

پارلیمانی نظام حکومت کی وکالت کرنے والے آزاد اندیش مفکرین کا کردار جانا پہچانا ہے۔ خاص طور پر جدید ترقی پسند طبقے کے قائدین میں سے ایک مرزا حسین خان سپاہ سالار، کہ جنہوں نے آزادی پسندوں کے مذہب اور اقتدار میں جدائی کے سیکولر موقف کو ان الفاظ میں بیان کیا: ''خالص دینی معاملات، جیسے نمازِ پنجگانہ، تقریبِ نکاح اور تبلیغی مجالس وغیرہ کو علماء پر چھوڑ دینا چاہیئے اور انہیں ریاستی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح یہ بات نہایت قابل اعتراض ہے کہ ریاست اور عوام کے درمیان علماء دلالی کریں۔''[3] تحریکِ جمہوریت کے دوران آزاد اندیش افراد اس سوچ کو پھیلاتے اور ذہنوں میں راسخ کرتے تھے۔ پہلی مجلس میں رشت کے نمائندے جناب وکیل التجار نے اپنے خطاب میں کہا: ''قرآن ہمارے دین کا ماخذ ہے اور آئین ریاست کے بنیادی قوانین کی وضاحت کر کے حکومت کے اختیارات کو محدود کرتا ہے اور لوگوں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔''[4] تہران کے نمائندے جناب حسن علی خان نے کہا: ''آئین کا قدیم فقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''[5]

جہاں تک علماء کی بات ہے تو آزادی پسند مجتہدین نے روایتی علماء سے اختلاف کیا اور آئینی جمہوریت کے مغربی فہم کے بجائے فقہی تصور پیش کیا۔ اس وقت کے مرجع اعلیٰ آیت اللہ محمد کاظم خراسانی (المعروف بہ آخوند خراسانی) نے کہا:

''درحقیقت آئینی جمہوریت کے اصول اسلام سے موافق ہیں۔''[6]

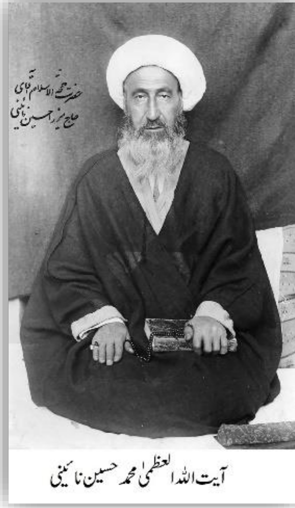
دوسرے مرجع آیت اللہ مرزا حسین تہرانی نے زور دیا کہ:

''مشروطہ (آئینی جمہوریت) کی اصطلاح جدید ہو سکتی ہے لیکن اس کا مفہوم قدیم اسلامی اصولوں سے نکلا ہے۔''[7]

عوامی تحریک کے آغاز سے ہی روشن فکر افراد اور آزادی پسند مجتہدین میں باہمی تعاون کی فضا تھی۔ تاہم جب مجلس میں آئین لکھنے کا مرحلہ آیا تو ان میں اختلافات پیدا ہوئے۔ ترقی پسند طبقہ ریاست کو مکمل سیکولر بنانا چاہتا تھا جبکہ علماء کی کوشش تھی کہ کوئی قانون ان کی مرضی کے بغیر منظور نہ ہو تاکہ وہ ایسے کسی بل کو رد کر سکیں جو فقہ سے ٹکراتا ہو۔ یہ بحث پہلی مجلس میں چلتی رہی اور سارے جمہوری دور میں اسکی بازگشت سنائی دیتی تھی۔

اس مقالے میں ترقی پسند علماء کے نمائندے کے طور پر آیت اللہ علامہ محمد حسین نائینی (1850ء–1936ء) کے نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی کتاب ''تنبیہ الامہ و تنزیہ الملہ'' اپنی طرز کی ایک اہم ترین کتاب ہے جس میں آئینی جمہوریت کی فقہی بنیادوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ آیت اللہ نائینی نے جمہوری انقلاب کی کامیابی کے چار سال بعد یہ کتاب لکھی۔ انہوں نے اس زمانے کے سیاسی علوم کا مطالعہ کیا اور جمہوری حکومت کے ابتدائی تجربات میں پیدا ہونے والے قانونی، سیاسی اور فقہی سوالات پر بھی غور کیا۔ آیت اللہ نائینی معروف مرجع آیت اللہ مرزا حسن شیرازی کے شاگرد تھے، جو 1891ء میں تمباکو کو حرام قرار دینے کا فتویٰ دینے کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔[8] وہ 1850ء میں نائین نامی قصبے کے ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے اور روایتی مذہبی تعلیم شیعیت کے مرکز نجف میں حاصل کی جو اس وقت عثمانی سلطنت کا حصہ تھا۔ وہ دینی علوم میں پہلی صف کے عالم بنے اور ایک متبحر شیعہ مجتہد کی شہرت پائی۔ آیت اللہ نائینی کو 1936ء میں نجف میں اپنی وفات تک شیعہ علماء کی طرف سے نہایت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

فارسی زبان میں لکھی گئی اس کتاب میں مقدمہ، پانچ ابواب اور ایک خاتمہ ہے۔ یہ پہلی بار 1909ء میں بغداد سے شائع ہوئی اور اس کی دوسری طباعت 1910ء میں تہران سے ہوئی۔ اس کتاب کی تیسری اشاعت 1955ء میں آیت اللہ سید محمود طالقانی کے حاشیے کے ساتھ ہوئی، جو ایک بڑے عالم ہیں۔ یہ نسخہ اس مقالے میں زیر بحث ہے۔ یہ کتاب ترقی پسند مراجع کے سیاسی اور سماجی نظریات پر کافی روشنی ڈالتی ہے اور بلاشبہ اس موضوع پر سب سے اہم دستاویز ہے۔ اس کو اُس دور کے مراجع، جیسے آخوند خراسانی اور آیت اللہ عبداللہ مازندرانی، نے بہت سراہا ہے، انہوں نے اس پر تبصرہ بھی لکھا اور اس کے متن کی تائید کی ہے۔ [9] [تنبیہ الامہ، ص 1]



آیت اللہ العظمیٰ محمد حسین نائینی

آیت اللہ نائینی جس بات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ بادشاہت کی ماہیت ہے، وہ مطلق اقتدار کو رد کرتے اور شرعی نقطۂ نگاہ سے آئین کی پابند حکومت (مشروطہ) کا دفاع کرتے ہیں۔ ان کا استدلال روایتی شیعہ اصولوں پر قائم ہے لیکن کچھ مقامات پر انہوں نے مغربی سیکولر نظریات کو بھی قبول کیا ہے، اور کوبی کی "طبائعِ استبداد" (مطبوعہ قاہرہ، سنہ 1905ء) سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ [10] آیت اللہ نائینی اپنے استدلال کی بنیاد حدیث اور سنت رسولؐ و آئمہؑ پر رکھتے ہیں، لیکن وہ مغرب کے آئینی نظریات اور پڑوسی ممالک کے واقعات سے بھی آشنا ہیں، مثلاً وہ 1905ء کے روسی انقلاب کو آمریت کے خلاف عوامی تحریک کی ایک مثال قرار دیتے ہیں۔ [11] [تنبیہ الامہ، ص 65] اسی طرح وہ مسلم ممالک میں مغرب کے سیاسی نفوذ سے بھی آگاہ ہیں اور مغربی تسلط کے خلاف مزاحمت کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے

ہیں۔ اپنے موضوع پر تسلط رکھتے ہوئے وہ قوی اور علمی دلائل کے ساتھ آئینی جمہوریت کی فقہی بنیادوں کو بیان کرتے ہیں۔ سیکولر آئین اور قدیم فقہ میں عدم مطابقت کو دیکھا جائے تو آیت اللہ نائینی کا استدلال ہمیشہ قانع نہیں کر پاتا۔ آئینی جمہوریت کا تصور جدید دور میں مغربی علوم سے ابھرا ہے۔ آمریت کو سب برائیوں کی جڑ کہہ کر ترقی پسند علماء نے ایک آئین نافذ کرنے کی فقہی توجیہ اس لئے فراہم کی تاکہ شاہ کے اختیارات کو محدود کر کے ریاست کے ظالمانہ اندازِ حکومت کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس کتاب کا جائزہ ایک سیکولر تصور کی مذہبی تشریح کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ مولف کے سماجی شعور کی وضاحت کے لئے بہت اہم ہے۔

آیت اللہ نائینی بحث کا آغاز ''حکومت'' کی کلی تعریف سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی سماجی نظام کو اپنی بقا اور دوام کیلئے کسی نہ کسی طرز کی حکومت کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئیے: ''چاہے وہ ایک فرد کے پاس ہو یا عوام کی امنگوں کی نمائندگی کرنے والی ایک اسمبلی کے پاس، چاہے وہ زبردستی اختیارات پر قابض ہو یا سماجی حق کے طور پر، وراثت کی بنیاد پر یا انتخابات کے ذریعے بنی ہو۔'' [12] [تنبیہ الامہ، ص 6] حکومت کی دو بنیادی ذمہ داریاں ہیں: پہلی امت کو تعلیم فراہم کرنا اور ان کے شخصی حقوق کا تحفظ کرنا، اور دوسری دشمنوں سے وطن کا دفاع کرنا۔ [13] [تنبیہ الامہ، ص 7] حکومت کی اس کلی تعریف میں آیت اللہ نائینی امت اور وطن کی اصطلاحات کو متبادل کے طور پر استعمال کر کے مذہبی اور سیکولر تصورات میں ربط پیدا کرتے ہیں اگرچہ جدید وطنی ریاست کا قدیم مذہبی کتابوں میں کوئی تصور نہ تھا۔ مذہب میں برادری کی بنیاد سرحدیں نہیں بلکہ عقائد ہوتے ہیں۔ ان کی طرف سے ایسی اصطلاحات کا استعمال نئے اجتہاد کا دروازہ کھول کر مذہبی عقائد اور مغربی سیاسی علوم میں ربط پیدا کرتا ہے۔

حکومت کی ایک کلی تعریف کرنے کے بعد آیت اللہ نائینی اس کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ ایک ظالمانہ حکومت ہے، جسے وہ استبدادیہ اور تملکیہ کہتے ہیں کہ جس میں آمر ریاست کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتا ہے اور

اپنے اعمال کا حساب نہیں دیتا اور عوام کو ''مویشی'' سمجھتا ہے۔[14][تنبیہ الامہ، ص8]ایسا حاکم قومی خزانے کو اپنے ذاتی رجحانات کے مطابق فضول خرچی میں ضائع کرتا ہے، من پسند لوگوں کو عہدے اور پیسہ دیتا ہے، جنہیں پسند نہیں کرتا ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا ہے اور عدلیہ کو جیسے چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ وہ لوگوں کا اپنے ذاتی میلانات اور خوشی کیلئے استحصال کرنے سے بڑھ کر ان کے بارے میں کچھ نہیں سوچتا۔ سرانجام وہ اپنے آپ کو روحانی امتیاز کا حامل اور الٰہی شخصیت سمجھنے لگتا ہے۔[15][تنبیہ الامہ، ص10] یہ ظالمانہ حکومت، جسے آیت اللہ نائینی بے بنیاد اور غیر شرعی قرار دیتے ہیں، حتمی طور پر زوال اور تباہی لے کر آتی ہے۔ وہ بنی امیہ کو ملوکیت کا بانی قرار دیتے ہیں جنہوں نے اپنے فائدے کیلئے شرعی ریاست کو عسکری ریاست میں بدل دیا۔[16][تنبیہ الامہ، ص17]ان کا کہنا ہے کہ اسلام کے ابتدائی سالوں میں قرآن و حدیث کی روشنی میں حکومت انصاف، منطق اور شفافیت کی بنیاد پر چلائی جاتی تھی اور مسلمان عظیم ولولے اور بہادری کے ساتھ دور دور تک اسلام کا پیغام لے کر گئے۔ اموی بادشاہت کے قیام کے بعد حکمرانوں نے عدل و انصاف کے بدلتے تقاضوں کو سمجھنا چھوڑ دیا اور حکومت اور معاشرے کے انتظام کے مسائل پر توجہ کم کر دی۔ اس انحراف نے آخر کار مسلمانوں کی طاقت کم کر دی اور قانون پر عملدرآمد مشکل بنا دیا، جس کا نتیجہ مسلمان معاشروں کی تخریب اور عوام کی بدحالی کی شکل میں نکلا۔[17][تنبیہ الامہ، ص17] آیت اللہ نائینی اس عمومی زوال کو ایران کے حالات سے جوڑ کر کہتے ہیں: ''ظالمانہ حکمرانی، طاقت کا غلط استعمال، ناانصافی، سرکاری ملازمین کی رشوت خوری نے اس ملک کو غربت اور بدبختی میں مبتلا کر دیا ہے۔''[18][تنبیہ الامہ، ص16]

دوسری قسم کی حکومت جس کی آیت اللہ نائینی تائید کرتے ہیں آئینی حکومت ہے، جسے وہ محدودہ، ولایتیہ، مسؤلہ اور شورائیہ کہتے ہیں۔[19][تنبیہ الامہ، ص11–12]اس کی طاقت عوام کی خدمت کا عزم اور شہریوں کا اس پر اعتماد ہے۔ ایسی مشروط حکومت کے بارے میں آیت اللہ نائینی کہتے ہیں کہ سیاسی امور میں عوام براہ راست شریکِ کار ہوتے ہیں اور سماجی ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں۔ حکمران ان کی

نمائندگی میں امورِ ریاست کو چلاتا ہے اور عوام کا خادم سمجھا جاتا ہے۔[20][تنبیہ الامہ، ص12] ایسی حکومت ولایت اور امانت کی بنیاد پر جائز ہے اور غیبتِ امامؑ میں (میسر نظاموں میں) سب سے اچھی حکومت ہے۔ اثنا عشری شیعیت کی روح امامت کا عقیدہ ہے، یعنی صرف آئمہؑ کے اقتدار کو جائز سمجھنا کہ جو حق کی حجت ہیں۔ اس کا مطلب آئمہؑ سے مودت اور ان پر ایمان ہے جو حضرت علیؑ کی اولاد میں وارثین رسولؐ ہیں اور امت کے موروثی قائدین ہیں۔[21] نویں صدی عیسوی میں بارہویں امامؑ کی غیبت کے بعد شیعہ علماء کی طرف سے ہر حکومت غیر اسلامی سمجھی جاتی رہی ہے، اور وہ عارضی حکومتوں کی طاقت کو شرعی جواز فراہم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ تاہم ایسی ریاست جو انصاف، نیکی، منطق اور شفافیت پر قائم ہو کو اسلامی نہیں تو عملی مجبوری کے طور پر شیعہ مرجع قبول کر سکتا ہے۔ آیت اللہ نائینی کہتے ہیں: ''چونکہ غیبتِ امامؑ میں ہم عدل اور علم اور تقویٰ کے منبع سے محروم ہیں، ہمیں بحالتِ مجبوری کسی اور بندوبست کی طرف دیکھنا ہے۔''[22][تنبیہ الامہ، ص56] سماجی معاہدے کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت اگرچہ اسلامی نہیں ہے لیکن اس میں آمریت کی نسبت کم برائی ہے۔[23][تنبیہ الامہ، ص41–42] اس طرح حکومت کو امامت سے الگ کر کے اور عارضی اقتدار کا راستہ ہموار کر کے آیت اللہ نائینی واضح کرتے ہیں کہ سماجی معاہدے کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کرپشن اور زوال سے مکمل طور پر پاک نہیں ہو سکتی۔ لہذا ایک اچھے حکمران کے اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال اور مکاری سے کام لینے کا احتمال بھی موجود رہے گا کیوں کہ وہ معصوم نہیں ہے۔ ایسے حالات میں برائی اور اختیارات کے غلط استعمال سے بچنے کے لئے کوئی عادل رہبر ڈھونڈنے کے بجائے اچھے ادارے قائم کرنا ہوں گے۔ لہذا اب سوال یہ نہیں کہ حکمران کون ہو، بلکہ یہ ہے کہ کس طرح ایسا سیاسی ڈھانچہ بنایا جائے جو افراد کو ناجائز کام کرنے سے روکے؟[24][تنبیہ الامہ، ص42]

آیت اللہ نائینی ایک مستقل آئین (نظام نامہ) تدوین کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں تاکہ شہریوں کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے اور آمریت کو مہار کیا جا سکے، اور وہ قانون کے تحفظ کے لئے ایک قومی مجلسِ

مشاورت قائم کرنے کی تجویز دیتے ہیں۔[25][تنبیہ الامہ، ص15]اس اسمبلی میں مذہب کے علماء کے ساتھ ساتھ عقلاء شامل ہوں گے جو عوام کے مفادات اور آئین کے تحفظ کو یقینی بنائیں گے۔ وہ عام انتخابات کی مدد سے مقننہ میں آئیں گے۔ اگر علماء سیاسی عمل میں شریک ہوئے تو مقننہ اور اس کے فیصلوں کی مذہبی حیثیت پر کوئی شک پیدا نہیں ہوگا۔[26][تنبیہ الامہ، ص15]آیت اللہ نائینی کہتے ہیں کہ آئینی جمہوریت حقیقت میں اسلامی فقہ سے ہم آہنگ ہے کیوں کہ شریعت میں حکومت کو عدل، مساوات اور رفاہ عامہ کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئیے۔ چنانچہ مثالی ریاست کی غیبت میں آئینی حکومت شفاف اور عادلانہ حکمرانی کے بنیادی عناصر بہم پہنچا سکتی ہے۔

وطنی آئین کے تصور کو فقہ سے ہم آہنگ کرنے کے بعد آیت اللہ نائینی سیاسی معاملات میں عوام کی شمولیت کو اقتدار کے ناجائز استعمال کے خلاف مزاحمت کے دینی فریضے سے جواز فراہم کرتے ہیں اور اسے سب مسلمانوں پر واجب قرار دیتے ہیں۔ اول اسلئے کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے، کہ جس پر وہ اسلامی فقہ کے اصول امر بالمعروف و نہی عن منکر کا اطلاق کرتے ہیں۔[27][تنبیہ الامہ، ص49] اگر کوئی حکمران اختیارات کا غلط استعمال کر رہا ہو تو عوام پر لازم ہے کہ اسے غلط کام کرنے سے روکیں اور اسے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے پر مجبور کریں۔ اس کام کو مؤثر طور پر انجام دینے کا طریقہ ایک آئین تیار کر کے ایک قومی مجلس قانون ساز قائم کرنا ہے۔[28][تنبیہ الامہ، ص50]دوم یہ کہ امامؑ کی غیبت میں مرجع، جو عوام کی نسبت زیادہ عالم اور پرہیزگار ہو، امورِ حسبیہ کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہے، جیسے اوقاف (کمیونٹی ویلفیئر) اور کم سن یتیم کی جائیداد کو سنبھالنا وغیرہ۔ چونکہ عوام کی بہبود، سماجی مفادات اور اخلاقی نظم اپنی اصل میں ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں، آیت اللہ نائینی کہتے ہیں کہ مرجع کو عوام کی قیادت کر کے سیاسی عمل میں مداخلت کرنی چاہئیے۔[29][تنبیہ الامہ، ص 51–52]سوم یہ کہ اگرچہ حکومت غصب شدہ ہے اور حاکم غاصب ہے، ایسا طریقہ وضع کیا جانا چاہئے جس سے ریاست کے اختیارات محدود کئے جا سکیں۔ ایک مقننہ کا قیام اور علماء کی نگرانی حکومت کے استبداد میں کمی لا کر اسے آئین کا پابند بنا سکتی

ہے۔[30][تنبیہ الامہ، ص57] ایسے میں حکمران ملک کے عاقل اور تعلیم یافتہ افراد کی مشاورت کے بغیر فیصلے نہیں کرے گا اور تمام اہم معاملات میں ان کا مشورہ قبول کرنے کا پابند ہو گا۔[31][تنبیہ الامہ، ص53]

آئینی جمہوریت کا قیام تبھی ممکن ہے جب عوام اپنے حقوق اور آزادیوں سے آگاہ ہوں۔ ''فردی آزادی ہی قومی وجود کا مبداء ہے'' اور استبداد اس کا دشمن ہے۔ ''تاریخ میں ہمیشہ سب انقلابات، چاہے مسیحی دنیا میں ہوں یا غیر مسیحی دنیا میں، کا مقصد فردی آزادیوں کا حصول اور ظلم کے راج کا خاتمہ رہا ہے۔''[32][تنبیہ الامہ، ص65] استبداد کی دست درازی سے شہریوں کے مفادات، چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، کو بچانے کیلئے قانون کی نظر میں سب کا برابر ہونا ضروری ہے۔ فقہ کے دائرے میں ایک مسلمان اپنی ذات پر مکمل حق رکھتا ہے، جس میں قانون کی نظر میں مساوات اور جائیداد کی ملکیت کا حق بھی شامل ہے۔ تاہم آیت اللہ کے ہاں حقوق کا تصور ''فطری حقوق'' کے جدید مفہوم کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ ''آئینی حقوق'' کے معنوں میں تھا۔ (عرضِ مترجم: انسان کے فطری حقوق کا عالمی اعلامیہ آیت اللہ نائینی کی وفات کے بارہ سال بعد 1948ء میں سامنے آیا، جسے اقوام متحدہ کے سب اراکین نے ایک عہد کے طور پر تسلیم کر رکھا ہے)۔ وہ افراد جو مذہب کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوں اور اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے ہوں، برابری کی بنیاد پر نوازے جاتے تھے۔ چنانچہ امیر ہوں یا غریب، خاص ہوں یا عام، سب کو شریعتِ محمدیہؐ کی رو سے برابر سمجھا جاتا تھا۔ آیت اللہ نائینی اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ قانون کی نظر میں مساوی قرار پانے کا مقصد مسلم اور غیر مسلم عوام کو حکومت کی زیادتیوں سے بچانا ہے۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ مساوات کے اس تصور کا مطلب شریعت میں دیئے گئے خاص امتیازات کو ختم کرنا نہیں ہے۔ غیر مسلم ذمی قرار پائیں گے اور وراثت، نکاح، جرائم کی سزا اور جزیہ جیسے موضوعات پر شرعی احکام کا اطلاق ہو گا۔ [33] آیت اللہ نائینی کی توجیہ کے باوجود فقہ اور سیکولر آئین میں یہ تضاد اپنی جگہ باقی رہا اور آئینی

تحریک کے ابتدائی سالوں میں ایران کی قومی اسمبلی کے مذہبی اور سیکولر ارکان میں بحث و تنازعہ کا سبب بنا رہا۔

تاہم قومی اسمبلی اور اس کے فرائض کے بارے میں آیت اللہ نائینی کے استدلال کا کمال دنیاوی اور مذہبی امور کے اداروں کو الگ الگ کرنا ہے۔ سیاسی نوعیت کے معاملات قومی اسمبلی کے سپرد کئے گئے ہیں۔ ارکان اسمبلی کو حکومت کے مختلف محکموں کی نگرانی کرنا، بجٹ بنانا، تجارتی معاملات میں اصلاح کرنا اور طاقت کے غلط استعمال کو ختم کرنا چاہئیے۔[34][تنبیہ الامہ، ص90] وہ واضح کرتے ہیں کہ اسمبلی کا کام سیاسی امور کو سنبھالنا ہے اور مذہبی ذمہ داریاں، جیسے نمازِ جماعت کا قیام یا فتویٰ جاری کرنا، اسمبلی کا کام نہیں ہے۔[35][تنبیہ الامہ، ص89]

خاتمہ میں آیت اللہ نائینی استبداد کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس سے مقابلے کے طریقوں پر بحث کرتے ہیں۔ وہ ظلم و جور کو سماج کی تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک استبداد کا ایک اہم ستون مذہبی شدت ہے۔ ایسے جعلی مقدس لوگ جو علمی تنقید کرنے کے بجائے عوام کو دھوکہ دینے کا کام کرتے ہیں اور شہریوں کے اعتماد کا غلط استعمال کرتے ہوئے خوف اور ڈر کی فضا قائم کر کے حکومت کے ظلم میں حصہ ڈالتے ہیں۔ مذہبی طبقے کی منافقت اور کٹر پن عوام کو جہالت میں پھنسائے رکھتا ہے۔ آیت اللہ نائینی تاکید کرتے ہیں کہ مذہبی اور سیاسی غنڈہ گردی میں تعلق نے مسلمانوں کو جامد پسماندگی کی دلدل میں دفن کر دیا ہے اور اس بدبختی میں مبتلا کر دیا ہے جس کے وہ آج شکار ہیں۔[36][تنبیہ الامہ، ص108–109] ایک شخص کو سب اختیارات دے دینے کی روایت اور فردِ واحد کی حکمرانی بھی استبداد کے اسباب میں سے ہے۔ ایک آمر جس کا اقتدار اپنی اصل میں مطلق ہو، لامحالہ عوام کو ملنے والے کسی اختیار یا آزادی کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھے گا۔[37][تنبیہ الامہ، ص109] خاتمہ میں آیت اللہ نائینی عوام کی جہالت، جس نے انہیں اپنے حقوق سے بے خبر رکھا ہے، کو جبر اور استبداد کے تسلسل کا

سبب قرار دیتے ہیں۔[38][تنبیہ الامہ، ص105–107] نائینی صاحب کہتے ہیں کہ استبداد، چاہے سیاسی ہو یا مذہبی، ظلم کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ وہ 1908ء میں ہونے والے سانحے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں مخالفین نے مذہبی کٹر پن کا سہارا لے کر قومی اسمبلی کو تباہ کیا۔[39][تنبیہ الامہ، ص119] ریاست کے جبر کا واحد حل عوام کو ان کے شہری حقوق کے بارے میں آگاہ کرنا اور شہری ذمہ داریاں نبھانے کیلئے ان کو تعلیم دینا ہے۔ پارلیمنٹ کا قیام اور آئین کی تدوین حقوق و فرائض پر عملدرآمد کرنے میں عوام کی مدد کرتے ہیں۔[40][تنبیہ الامہ، ص63–64]

تنبیہ الامہ و تنزیہ الملہ روایتی استبداد کے مقابلے میں جدت پسند علماء کے کردار کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس پر جدید مغربی تصورات کا اثر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب جدید قومی ریاست کے بارے میں مذہبی طبقے کی ترقی پسندانہ سوچ کی عکاسی بھی کرتی ہے، اور کلی طور پر تحریکِ جمہوریت کے دوران سامنے آنے والی اپنی نوعیت کی نہایت توانا اور محکم توضیح ہے۔ مزید یہ کہ اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ پہلی چھاپ کے بعد سے آیت اللہ نائینی کی یہ کتاب (اہل تشیع کے) ترقی پسند مذہبی حلقوں میں آئینی جمہوریت اور حکمران اور عوام کے حقوق کے بیان کیلئے بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

# آیت اللہ سیستانی: جمہوریت کے نگہبان

پروفیسر کارولین ساتج

(عرضِ مترجم: یہ مضمون پروفیسر کارولین ساتج کی کتاب ''پیٹریاٹک آیت اللہ ز'' کے دوسرے باب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں فاضل پروفیسر نے نجف کے مراجعِ اربعہ، بالخصوص دنیا بھر کے اہلِ تشیع کے مرجعِ اعلیٰ آیت اللہ سیستانی، کی جمہوری جدوجہد پر تحقیق کی ہے۔ حوالہ جات آن لائن نسخے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ آیت اللہ سیستانی کے نمائندے جناب حامد الخفاف کی تدوین کردہ کتاب ''النصوص الصادرہ''، طبع ششم، بیروت، سنہ 2015ء کے حوالے مضمون میں شامل کئے گئے ہیں۔)

20 جنوری 2003ء کو، عراق پر امریکی حملے کے آغاز سے دو ماہ پہلے، بش انتظامیہ نے پینٹا گون کو عراق کی سیاسی اور معاشی تنظیمِ نو کے عمل کی نگرانی کیلئے تعمیرِ نو اور انسانی امداد کا ادارہ (او آر ایچ اے) قائم کرنے کا حکم دیا۔ اس ادارے کے سربراہ جے گارنر کو بتایا گیا تھا کہ ان کی ماموریت آسان اور مختصر ہو گی۔ محکمہ دفاع کے نائب معتمد برائے حکمت عملی، ڈوگلس فیتھ نے کہا کہ نوے دن میں ایک عبوری حکومت قائم کر کے سفارتی تعلقات بحال اور امریکی فوج کا انخلا شروع کر دیا جائے گا۔ بش انتظامیہ امریکی عوام کو بتاتی رہی تھی کہ عراق پر طویل مدت کیلئے قبضہ برقرار رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی کیوں کہ عراقی عوام امریکی فوج کا آزاد کنندگان کی طرح استقبال کریں گے۔ خیال یہ تھا کہ صدام حسین کے بعد تعمیرِ نو کے امریکی منصوبوں کی کوئی مخالفت نہ ہو گی۔ اس کے اقتدار سے محروم ہونے کے بعد عراق امریکہ کے سامنے ایک صاف تختی کی طرح ہو گا۔ شروع میں گارنر بعث پارٹی کو استحکام اور امن کو قائم رکھنے کیلئے باقی رکھنا چاہتا تھا تاکہ پہلے سے موجود ریاستی انتظامیہ کو ساتھ لے کر چلے، لیکن یہ رائے امریکی محکمہ دفاع کے سینئر عہدیداروں اور نائب صدر کے ہاں غیر مقبول تھی۔ ان اداروں میں امریکی حملے کے منصوبہ

ساز بعد از صدام کی عراقی ریاست کی شکل گیری میں ان عراقیوں کے ساتھ مل کر چلنا چاہتے تھے جنہیں صدام کے زمانے میں وطن چھوڑنا پڑا تھا۔

21 اپریل 2003ء میں، جنگ شروع ہونے کے ایک ماہ بعد، گارنر کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کر کے اس ادارے کو تحلیل کر دیا گیا اور 11 مئی کو نیدرلینڈ میں امریکہ کے سابق سفیر اور محکمۂ خارجہ کے سینئر افسر پال بریمر کی سربراہی میں سلطۃ الائتلاف المؤقتۃ (کوالیشن پروویژنل اتھارٹی؛ سی پی اے) کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کیا گیا۔ 28 جون 2004ء میں عبوری حکومت کے قیام تک سی پی اے نے عراق پر بلا شرکت غیرے حکومت کی۔ سابقہ تارکین وطن اور دو کرد جماعتوں کے مشوروں پر چلتے ہوئے ایک وائسرائے کے انداز میں بریمر نے بہت سے مثالیت پسندی پر مبنی فیصلے کئے جو عراق کے سماجی اور سیاسی حقائق کی بابت کم علمی اور لاتعلقی کا مظہر تھے۔ فرامین میں عراقی ریاست سے بعثی اثرات کا صفایا اور عراقی فوج کے کور کمانڈرز کو منصبوں سے ہٹانا سرفہرست تھا۔ بریمر نے بعثی اثرات کے خاتمے کے عمل پر پوری لگن سے کام کیا کہ جس کے نتیجے میں ہزاروں فوجی افسروں کو تنخواہوں اور مراعات سے محروم کر کے مستقبل میں سرکاری نوکریوں کیلئے نااہل قرار دیا گیا۔ وہ عراقیوں کی اکثریت کی رائے معلوم کرنے کے کسی طریقہ کار کو وضع کئے بغیر معیشت کے بڑے حصے کو نجی ملکیت میں دینے، اعلیٰ تعلیم کے نظام کی تنظیمِ نو اور آزاد جمہوری ریاست کے قیام کے قائل تھے۔ ان منصوبوں پر عمل درآمد کی ذمہ داری سی پی اے کے ذیلی افسران اور پرائیویٹ کنٹریکٹرز کے کندھوں پر تھی جن میں سے اکثر کے پاس اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہ تھا اور ان میں سے کچھ تو محض نظریاتی طور پر بریمر سے اتفاق رکھنے کی بدولت چنے گئے تھے [1]۔

بریمر نے عراق گورننگ کونسل کو ان منصوبوں کا عراقی چہرہ قرار دیا۔ ایک ایسا ڈھانچہ جسے انہوں نے یہ سوچ کر تخلیق کیا تھا کہ اس میں عراق کے تمام نسلی اور مذہبی گروہوں کی نمائندگی ہونی چاہئیے۔ ارکان کو

ان کی سیاسی سوچ یا پیشہ وارانہ مہارت کی بجائے گروہی تعلقات کی وجہ سے چنا گیا تھا۔ اگرچہ اس کونسل کے پاس اختیارات بہت کم تھے لیکن اس کی ترکیب نے اس روایت کی بنیاد رکھی کہ صدام کے بعد کے عراق میں آزاد جمہوریت شناخت کے خطوط پر چلے گی۔ اس نظام میں ملک کی سیاسی اور انتظامی طاقت مذہبی اور نسلی بنیادوں پر تفویض ہونا تھی۔

بش انتظامیہ اور میڈیا کے مرکزی دھارے سے تعلق رکھنے والے مبصرین کی طرح بریمر نے بھی فرض کر لیا تھا کہ آمریت کے عادی عراقی لوگ امریکہ کا ترتیب دیا گیا تعمیرِ نو کا منصوبہ من و عن تسلیم کر لیں گے۔ اس مفروضے میں بہت خامیاں تھیں۔ اگلے پندرہ مہینوں میں جیسے جیسے بریمر نے عراق کی تشکیلِ نو کا کام آگے بڑھایا، انہیں متعدد حلقوں کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بریمر کیلئے شاید سب سے زیادہ تعجب آور بات آیت اللہ سیستانی کی ان منصوبوں کے خلاف شدید مزاحمت تھی، کہ جس میں باقی تین مراجع ان کے ساتھ تھے۔ جیسا کہ اپنی کتاب کے سابقہ ابواب میں دیکھا جا چکا ہے، امید یہ تھی کہ آیت اللہ صاحبان صدیوں پرانی سکوت کی روش پر عمل پیرا ہو کر سیاست سے کنارہ کش رہیں گے۔ اس کے برعکس وہ نہایت دلچسپی سے سیاسی عمل کا جائزہ لیتے رہتے تھے اور جب ضروری سمجھتے مداخلت کرتے تھے۔ عام غلط فہمی کے برعکس آیت اللہ صاحبان صدام کے بعد کے عراق میں عوام کے حق حاکمیت، مساوات، شفافیت اور جمہوریت کے بارے میں ہونے والی بحثوں میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ [2]

اگرچہ اس باب میں ہماری توجہ آیت اللہ سیستانی پر ہو گی لیکن باقی تینوں مراجع نے جمہوری عمل کے سلسلے میں ان کے ہر اہم فتوے اور اعلامیے کی تائید کی۔ انہوں نے آیت اللہ سیستانی کے انتخابات اور جمہوری ریاست کے جواز کو قائم کرنے کے اقدام کے علاوہ 2014ء میں نوری المالکی کو تیسری بار انتخاب لڑنے سے روکنے جیسے فیصلوں کی تائید کی۔ اس باب میں آیت اللہ سیستانی پر تمرکز کرنے کا مقصد قاری کو ان کے مدبرانہ کردار کی اہمیت کا احساس دلانا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ حوزۂ نجف کی روح اور طرز عمل کے

مرکزی نمائندے کا کردار ادا کیا، اگرچہ وہ اس میں اکیلے نہ تھے۔اس باب کو ترتیبِ زمانی کے ساتھ پیش کرنے کا مقصد قاری کو اس راستے کی سیر کرانا ہے جس پر چلتے ہوئے عراقی سیاست آیت اللہ سیستانی کے گرد متشکل ہوئی۔ یہ باب اور آیت اللہ سیستانی کا کردار قاری کو نجف اور بطور کلی عراق کی سیاسی ثقافت سے روشناس کرائے گا۔ یہ اجمالی عکاسی عراق کی جمہوریت، فرقہ بندی اور مذہبی کرداروں کے بارے میں کچھ غلط فہمیوں کے خاتمے میں مدد دیتی ہے۔اس کی بہترین مثال آیت اللہ سیستانی کا کام ہے۔



آیت اللہ العظمیٰ خوئی اور ان کے شاگرد آیت اللہ العظمیٰ سیستانی

آیت اللہ سیستانی اور ان کے ساتھی مراجع نے سیاسی مداخلت کرتے وقت ''عراقی عوام کی مرضی'' کا پاس کیا، یہ اصطلاح وہ اکثر استعمال کرتے ہیں، اور اسی اصول کو انہوں نے عراق کے سیاسی عمل کی مشروعیت کی بنیاد قرار دیا۔ جمہوریت کے بارے میں ان کا نظریہ نہ تو مغرب سے لیا گیا تھا نہ ہی، غیر ملکی

مبصرین کی رائے کے برعکس، ایران سے لیا گیا تھا، بلکہ یہ نظریۂ جمہوریت قومی وحدت، تکثر پسندی، عوامی قبولیت، ووٹ کی تکریم اور انسانی حقوق جیسے ہمہ گیر تصورات سے مالا مال تھا۔ انہوں نے بڑی دقت سے فرقہ وارانہ نظامِ حکومت کے خلاف عوامی غم وغصے کو درست سمت میں موڑ دیا۔ سرانجام یہ امریکی نہیں بلکہ آیت اللہ صاحبان تھے جنہوں نے 2003ء کے بعد عراق کی نوزائیدہ جمہوریت کی پاسبانی کی۔

چنانچہ یہ باب آیت اللہ سیستانی کے 2003ء کے بعد کے حالات میں ظاہر ہونے والے نظریات کی لطافتوں اور باریکیوں کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے۔ 2003ء سے 2006ء تک کے عبوری دور میں انہوں نے اس بات کو یقینی بنانے کیلئے بہت کام کیا کہ ریاست کی بنیاد مضبوط جمہوری اقدار اور روایات پر قائم ہو۔

ریاست میں تبدیلی کے موضوع پر تحقیق کرنے والے عقلاء کے ہاں عبوری دور میں ''جمہوریت کا استحکام'' ایک نازک تصور ہے۔ اس کی فہم پر اجماع نہیں ہو سکا ہے۔ استحکام سے میری مراد یہ ہے کہ عراق میں ادارے بن گئے تھے: ایک باقاعدہ آئین لکھا گیا تھا، نئی سیاسی جماعتیں ابھر آئی تھیں، جیسے تیسے پارلیمانی سیاست شروع ہو گئی تھی، انتخابات ہوا کرتے تھے، اور قیادت میں تبدیلی آتی رہتی تھی۔ میں اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے جمہوریت کی مضبوطی یا ریاست کے بکھرنے جیسی چیزوں کے بارے میں پیشگی کوئی مفروضہ قائم نہیں کرتی۔ میرا اس اصطلاح کو استعمال کرنے کا مقصد ان دو ادوار میں فرق کرنا ہے، ایک وہ عبوری دور کہ جب عراق امریکہ کے ماتحت تعمیرِ نو کے عمل سے گزر رہا تھا اور دوسرا وہ جب اقتدار عراقیوں کو منتقل کیا جا چکا تھا، اگرچہ امریکی فوج دسمبر 2011ء کے بعد نکلی۔ میری تحقیق 2003ء سے 2016ء کے درمیانی عرصے میں محدود ہے، اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ ریاست میں استحکام پیدا ہونے کا عمل کئی عشروں پر محیط ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ میں 2007ء سے 2009ء کے درمیان عراق میں امریکی سفیر رہنے والے ریان کروکر کے اس بیان کو سنجیدہ لیتی ہوں کہ ''ہم ان کے سیاسی نظام کی بافت میں اس طرح سلے ہوئے ہیں کہ ہمارے بغیر اس نظام کا چلنا ممکن نہ ہوگا۔''[3]

اگرچہ آیت اللہ سیستانی عراق کی سیاست کے سب سے طاقتور کردار ثابت ہوئے ہیں، لیکن جمہوریت پر ان کا پختہ ایمان اس بات کا سبب ہوا کہ وہ جمہوری عمل میں کبھی خلل نہ ڈالیں چاہے یہ ان کی آنکھوں کے سامنے ناکامیوں سے بھی دوچار ہوتا رہے۔

## عبوری دور کا آغاز

بریمر صاحب شروع میں یہ سوچتے تھے کہ وہ عراقیوں کی اکثریت کی پرواہ کئے بغیر تعمیرِ نو کے منصوبوں پر عمل درآمد کر لیں گے۔ اس فہم کیلئے ان کا تکیہ احمد الجلبی اور ایاد علاوی جیسے سابقہ تارکین وطن کے ساتھ ساتھ کرد رہنماؤں پر تھا کہ جو نسلی اور مسلکی بنیادوں پر طاقت کی تقسیم چاہتے تھے۔ نئے نظام کی بنیاد تشخص کی سیاست پر رکھی جا رہی تھی، جس میں معاہدے اور اتحاد برابر کے شہری ہونے اور قومی منصوبوں سے لگاؤ کی بجائے فرقہ وارانہ شناخت کی بنیاد پر قائم ہونے تھے۔ بریمر کے عراقی ساتھی یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ نظام سنی عرب اقلیت کی آمریت کے دوبارہ آجانے کا خطرہ ٹال دے گا۔ لیکن ایک دفعہ یہ نظام رسمی حیثیت اختیار کر لیتا تو یہ فرقہ وارانہ نمائندگی کو بھی رواج دیتا اور مستقبل کی سیاسی ثقافت انہی سانچوں میں ڈھلتی۔

عراق کے مستقبل کیلئے عبوری دور نہایت اہم تھا، کہ جس میں نئی ریاست کے خد و خال واضح ہونے تھے اور یہ آنے والے عشروں میں ہونے والے آئینی عمل کی آزمائش کا مرحلہ بھی تھا۔ صدام کی شکست کے بعد ریاست کے پرانے اداروں کی جگہ نئے ادارے لے رہے تھے، نئی فوج اور پولیس بنانے کے ساتھ ساتھ نئے سیاسی ادارے بھی قائم ہوئے۔ بریمر یہ سوچ رہے تھے کہ عراق میں ادارہ سازی مکمل ہونے سے پہلے وہ فرمان جاری کر کے حکومت چلا سکتے ہیں۔ انہوں نے سی پی اے کو ملک کا نیا آئین بنانے کا اختیار سونپ دیا۔ یہ متنازع اقدام تھا کیونکہ اس کے پہلے مسودے کی قابل اعتراض چیزوں میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ وہ جماعتیں جنہوں نے امریکی حملے کی مخالفت کی تھی، الیکشن میں شمولیت کی اہل نہ ہوں

گی۔ پس بریمر نے عراقیوں کی ایک مجلس بنا کر انہیں ایک قومی منشور تدوین کرنے کا اختیار دیا اور عراق کی خود مختاری کو التوا میں ڈالا۔

جونہی آئین کے بارے میں بریمر کا منصوبہ ذرائع ابلاغ میں نشر ہوا، 26 جون 2003ء کو آیت اللہ سیستانی اپنے مشہور ''جمہوری فتویٰ'' کے ساتھ سیاسی منظر نامے پر نمودار ہوئے۔ ان سے کچھ مقلدین نے سی پی اے کی طرف سے مجلسِ آئین ساز کے ارکان کی تقرری کی بابت سوال پوچھا تھا، جن کو تمام سماجی اور سیاسی قیادتوں سے مشاورت کے بعد ایک مسودہ تیار کر کے ریفرنڈم کیلئے پیش کرنا تھا۔ آیت اللہ سیستانی نے جواب میں کہا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم

ان طاقتوں کے پاس مجلسِ آئین ساز کے ارکان کی تقرری کا اختیار نہیں ہے۔ اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ یہ مجلس ایک ایسا آئین تیار کرے گی جو عراقی عوام کے مفادات کے مطابق ہو گا اور عراق کی قومی شناخت، کہ جس کا انحصار دینِ اسلام اور اعلیٰ معاشرتی اقدار پر ہے، کی ترجمانی کرے گا۔ مذکورہ منصوبہ کسی صورت قابل قبول نہیں ہے۔ سب سے پہلے عام انتخابات کا انعقاد کیا جانا چاہیئے تاکہ ووٹ کی اہلیت رکھنے والے ہر عراقی شہری کو یہ موقعہ ملے کہ وہ اپنی نمائندگی کیلئے تأسیسی مجلسِ آئین ساز کے رکن کا انتخاب کر سکے۔ اس کے بعد تیار شدہ مسودے کو عوامی ریفرنڈم کیلئے پیش کیا جا سکتا ہے۔ سب مومنین کو اس اہم مقصد پر اصرار کرنا چاہیئے اور اس کو حاصل کرنے کیلئے بہترین انداز میں کوشش کرنی چاہیئے۔ خدا سب کی بہتری اور سود مندی کی طرف رہنمائی کرے!

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مہر و دستخط

علی الحسینی السیستانی

26 جون 2003ء"[4][النصوص الصادرہ، صفحہ 35،36]

اس فتوے میں آیت اللہ سیستانی نے ان مراحل کی نشاندہی کی جن سے گزر کر عراق جمہوریت سے ہمکنار ہو سکتا تھا۔ انہوں نے تقرری کے بجائے براہ راست انتخابات پر زور دیا تاکہ "ہر عراقی" ایک منتخب شدہ مجلسِ نمائندگان کیلئے رائے دینے کا مجاز ہو۔ سال بھر "ایک فرد، ایک ووٹ" کے اصول پر عام انتخابات کے اسلوب پر زور دینے کا سلسلہ جاری رہا۔

عوام کی رائے کو شامل کرنے پر آیت اللہ سیستانی کی یہ تاکید "جمہوری فتویٰ" دینے سے پہلے بھی موجود تھی۔ 3 مئی 2003ء کو جب ان سے ایسا ہی ایک سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا تھا:

"عراق میں حکومت کے نظام کا فیصلہ عوام نے کرنا ہے۔ مرجع کا ملک کی حکومت اور اقتدار میں کوئی کردار نہیں ہوگا۔"(المرجعیہ لا تمارس دوراً فی السلطہ والحکم)

اور اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ شیعوں کو سی پی اے کے ساتھ تعاون کرنے کا کہیں گے، انہوں نے کہا:

"ہم ایسی حکومت بننے کا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں جو عراقی عوام کے ارادے کا مظہر ہو اور تمام فرقوں اور نسلوں کو شامل کرتی ہو۔"[5](الذی نریدہ ہو ان یفسح المجال لتشکیل حکومۃ منبعثۃ من ارادۃ الشعب العراقی بجمیع طوائفہ واعراقہ [النصوص الصادرہ، صفحہ 22،23])

انہوں نے کسی ایک فرقے کو ترجیح نہیں دی نہ ہی شیعوں کی اس بنیاد پر طرف داری کی کہ وہ عددی اکثریت تھے۔ وہ صدام حسین کے زمانے میں سنی عربوں کو باقی سب پر ترجیح دینے کے آمرانہ اقدامات کے پیش نظر بہت احتیاط اور تدبر سے کام لیتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے وہ یہ سمجھتے تھے کہ صدام کا ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' والا طرز عمل اب سی پی اے کی شکل میں دوبارہ مسلط کیا جارہا تھا، جو کہ عراق پر انگریزی قبضے کی یادگار تھا۔

آیت اللہ سیستانی کے ان بیانات کا ڈرامائی اثر ہوا۔ انہوں نے اہم جمہوری بیانیے کو عوامی حلقوں میں زیر بحث بنادیا اور اکثر اوقات بریمر کے منصوبوں کو ناکام بنادیا۔ بریمر کا ہر اہم فرمان پر دستخط کرنے کا خصوصی اختیار صدام حسین کے اس مشہور قول کی یاد دلاتا تھا کہ ''اگر میں کاغذ پر لکھ دوں تو وہ قانون ہوگا۔''[6] ایک وائسرائے کے طور پر بریمر ایک دستخط کے ساتھ پرانے قوانین کو منسوخ اور نئے قوانین کا اطلاق کر سکتا تھا۔[7] عراقی عوام آمرانہ متلون مزاجی کے عادی تھے لیکن آیت اللہ سیستانی جمہوری آئین کی پابند حکومت (مشروطہ) قائم کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ آمریت کے خاتمے کیلئے انہیں سیاسی رقابت اور عوامی شمولیت، سماجی ذمہ داریوں، موثر انتخابات، اور نئی ریاست کی عوامی مقبولیت پر زور دینا اور ان میں التوا کی صورت میں پیدا ہونے والے خطرات سے آگاہ کرتے رہنا تھا۔

ریاست میں تحول پر تحقیق کرنے والے عقلاء کے روایتی خیال کی پیروی کرتے ہوئے بریمر یہ سمجھ رہے تھے کہ جمہوریت کی طرف جانے میں انتخابات سے آغاز کرنا خطرناک ہوگا۔ بریمر کا منصوبہ ایک فری مارکیٹ والی سرمایہ دارانہ جمہوریت قائم کرنا تھا۔ بریمر کے اقدامات میں ریاستی کاروباروں کو عوامی ملکیت میں دینے کی تجویز بھی شامل تھی۔ انہوں نے کہا: ''اگر ہم ان کی معیشت کی اصلاح نہ کریں تو ہمارے سیاسی تحول کے منصوبے جتنے بھی اچھے ہوں، کام نہیں کریں گے۔'' انہیں ایک فری ٹریڈ زون بنانے کا خیال بھی تھا جس سے عالمی برادری کو فائدہ ہو۔ مجوزہ نمونے میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ ایک نئی تاجر

برادری کی مدد سے سرمایہ داری کی طرف حرکت ایک متوسط طبقہ پیدا کرنے کو یقینی بنائے گی۔ یہ طبقہ سیاسی اصلاحات اور جمہوریت کے قیام میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔ انتخابات کے بجائے بازار کو اہمیت دی جا رہی تھی۔[8]

اس عمل کے نتیجے میں، کہ جسے سیموئیل ہنٹنگٹن نے جمہوریت کی تیسری لہر کہا تھا، 1990ء کی دہائی تک دنیا میں سو کے قریب نوزائیدہ جمہوریتیں وجود میں آچکی تھیں۔ ان سب میں انتخابات ہوتے تھے لیکن وہ ''آزاد جمہوریتیں''، نہیں تھیں کیوں کہ ان میں مہذب آزادیوں اور انسانی حقوق کا کماحقہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ فرید ذکریا جیسے نقادوں نے اس نکتے کو اٹھایا کہ انتخابات پر زور دینے سے ترقی پذیر دنیا میں ''بے روح جمہوریت'' کو فروغ ملتا ہے۔ پس انتخابات کو التواء میں ڈالنا ہو گا۔ یہ بیانیہ غیر سیاسی آزادیوں کا احترام کرنے والی آمریت کو ایسی جمہوریت پر فوقیت دیتا تھا جس میں مہذب آزادیوں پر قدغن لگائی جائے۔ زکریا نے آگے چل کر کہا کہ سعودی عرب کی طرح کی ریاستوں کو یکدم جمہوری بنانے کا نتیجہ ''جیفرسن کی جمہوریت''، نہیں بلکہ ''طالبان کی ملائیت'' ہو گا۔ انہوں نے عرب حکمرانوں کو آمر قرار دیا لیکن ایسے آمر جو انتخابات سے برآمد ہونے والے حکمران سے زیادہ لبرل، بردبار اور تکثر پسند تھے۔ انہوں نے خاص طور پر اس خدشے کی نشاندہی کی کہ اخوانی جماعتیں انتخابات میں شامل تو ہوں گی لیکن ان کو جمہوریت کے بغض میں ''ایک ووٹ، ایک بار'' کا نمونہ بنا کر رکھ دیں گی۔ عبوری دور سے گزارنے والے معاشروں کی مثال کے طور پر انہوں نے بوسنیا کی صورت حال کو آزادیوں کی ضمانت دینے والی جمہوریت کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا جہاں ڈیٹون کے امن معاہدے کے ایک سال بعد لوگ ووٹ دینے گئے اور اس عمل کا نتیجہ نسلی تعصبات کو بڑھاوا دینے کی صورت میں نکلا۔ انہوں نے کہا کہ مشرقی تیمور اور افغانستان میں قومی ریاست کی تشکیل کو لمبے عرصے تک طول دینے کا عمل ایک بہتر نمونہ ہے۔ انہوں نے عبوری دور کیلئے پانچ سال تجویز کئے جن میں سیاسی اصلاحات اور اداروں کی تعمیر کا عمل مکمل کیا جائے اور پھر قومی سطح پر کثیر الجماعتی انتخابات کرائے جائیں۔[9] وہ عراق میں التواء کے قائل تھے، جسے مقامی

آبادی اور عراق کے امور کے ماہرین مسائل کی جڑ سمجھ رہے تھے۔ زکریا کے موقف کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ مغربی دنیا میں فردی آزادیوں اور جمہوریت کے درمیان ایک مضبوط تعلق بن چکا تھا جو دنیا کے دوسرے حصوں میں وجود نہیں رکھتا تھا۔

یہ محتاط سوچ امریکی حلقوں میں عام تھی اور ریاست میں تبدیلی کے عمل کے آیت اللہ سیستانی کی خواہش کے مطابق مکمل طور پر عراقی بننے میں رکاوٹ تھی۔ مثال کے طور پر ایک سابقہ انتظامی عہدیدار نے کسی نجی بیان میں کہا تھا کہ وائٹ ہاؤس کردوں اور سنی عربوں کو ویٹو کی طاقت دے کر عراق میں شیعہ ملائیت (ولایتِ مطلقہ فقیہ) کا راستہ روکنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا، ''یہاں جیفرسن کی جمہوریت نہیں بننے والی'' اور ''یہ سوچنا حماقت ہوگی کہ عراقی لوگ (اخوانی) اسلام کی ملاوٹ کے بغیر ایک آئین لکھ سکتے ہیں اور ایک جمہوریت بنا سکتے ہیں۔'' [10] پس اگرچہ علمی حلقوں میں فرید زکریا کے تصور کا بہترین انداز میں رد کیا جا چکا تھا، لیکن ہنوز مقتدر حلقوں میں اور عملی میدان میں یہ احساس حاوی تھا کہ آزادی ناکام ہو جائے گی۔ مفروضہ یہ تھا کہ عراق کی شیعہ اکثریت کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ ایک مذہبی سیاست دان کے پیچھے لگ کے ایک ''بے روح جمہوریت'' قائم کریں گے۔ وہ اس بات سے غافل تھے کہ وہاں طاقت کسی ایک جگہ مرکوز نہ تھی اور اگرچہ شیعوں میں مذہبی سیاسی عزائم رکھنے والی جماعتیں تھیں لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ سب ایک ہی ہدف رکھتی تھیں۔ تعمیرِ نو کے سارے منصوبوں پر انسداد کی سوچ چھائی ہوئی تھی۔ اس میں شیعیت کو یکساں اور بسیط فرض کیا گیا تھا اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ شیعوں کی سب جماعتیں (اخوان المسلمین کی طرح) مذہبی عقائد کا سیاسی استعمال کرتی تھیں۔ ان خیالات کو سمجھنے کیلئے خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر ''بے روح جمہوریت'' کی بار بار دہرائی جانے والی بات کہ جس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ شیعہ تحرک ''تھامس جیفرسن کی جمہوریت'' کا الٹ ہے، کئی مغالطے لئے ہوئے ہے۔

کیا عراقی عوام امریکہ دشمنی پر مبنی ایرانی نظام کو اپنا لیں گے؟ کیا وہ اقلیتوں کے حقوق کا احترام کریں گے؟ ممکن ہے کہ بریمر کے ذہن پر یہ سوال چھائے ہوں لیکن آیت اللہ سیستانی ان پر غور کرنے کو تیار نہ تھے۔ آیت اللہ سیستانی کا انتخابات کے بارے میں عقیدہ، جسے انہوں نے عوامی مقبولیت کے ساتھ بھی جوڑ دیا، ان محققین کی آراء سے ہم آہنگ تھا جو جمہوری عمل کا دوسرا رخ دیکھ رہے تھے۔ مثلاً مارک پلاٹنر صاحب کا کہنا تھا کہ جمہوریت اور مہذب آزادی میں تاریخی طور پر کوئی رشتہ وجود نہیں رکھتا ہے۔ مہذب آزادیوں کے احترام کے نظریئے کی جائے پیدائش جدید انگلستان ہے کہ جس میں انیسویں صدی تک ووٹ ڈالنا ایک بڑے محدود حلقے کا حق سمجھا جاتا تھا۔ پلاٹنر صاحب جان لاک کی کتاب ''سیکنڈ ٹریٹائز آف گورنمنٹ'' کو انسانی مساوات اور اکثریت کی رائے کے احترام پر زور دینے کی وجہ سے فردی آزادیوں کے احترام کی سوچ کا مصدر مانتے ہیں۔ پس سیاسی طاقت کا مأخذ آزادی اور برابری سے ہمکنار ہونے والے افراد کی رضایت ہے۔ لاک کے فکری نظام میں سیاسی ڈھانچے اور طرزِ حکومت کے انتخاب میں سب کی مرضی شامل ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مہذب آزادی کا نظریہ ''عوام کی حاکمیت پر بے چوں وچرا یقین رکھتا ہے''، یہی نکتہ آیت اللہ سیستانی بار بار اٹھا رہے تھے۔ [11] پلاٹنر صاحب انتخابات کی بنیاد رکھنے پر زور دیتے ہیں کیوں کہ کلی طور پر جن ممالک میں انتخابات باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں وہ فردی آزادیوں کے احترام میں ان سے بہتر ہیں جن کے ہاں ایسا نہیں ہوتا، اور جن ممالک میں سماجی آزادیوں کا احترام کیا جاتا ہے ان میں انتخابات میں دھاندلی کا امکان بھی کم ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب جمہوری ادارے بن جائیں تو مہذب آزادی اور انتخابی جمہوریت میں ایک اٹوٹ رشتہ اور قریبی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ [12] ریاستوں کو جمہوریت کی منزل حاصل کرنے کیلئے مغرب کے راستوں پر چلنا ضروری نہیں ہے۔ پلاٹنر صاحب کو اس بات سے اتفاق نہیں تھا کہ کچھ خاص عبوری مراحل میں مغربی ممالک کو ''مرحلہ وار جمہوریت'' کی حمایت کرنی چاہیئے۔ کسی اصول کے تحت بھی انتخابات پر قدغن کو قبول نہیں کیا جا سکتا اور انتخابات کے سوا حکمران کے تعین کا کوئی اور جائز طریقہ نہیں ہے۔ اسی طرح اس مفروضے

کی بھی کوئی بنیاد نہیں کہ اگر مسلمان معاشروں کو آیت اللہ سیستانی کے بتائے ہوئے طریقے پر اپنے ادارے بنانے کی آزادی دی جائے تو وہ انسانی حقوق کے تحفظ کو ووٹ نہیں دیں گے یا شخصی آزادیوں کے تحفظ کی طاقت نہیں رکھتے ہوں گے۔ ان بحثوں سے مستشرقین کے تعصب کی بو آتی ہے اور اس لب و لہجہ کی جو برطانوی استعماری دور کی پالیسی ساز گرٹروڈ بیل نے اپنے باپ کے نام خط میں استعمال کیا ہے کہ اقتدار ان ''عجیب و غریب لوگوں'' کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ آیت اللہ سیستانی اس قسم کے مفاہیم کے دوبارہ احیا کے خلاف ڈٹ گئے۔

2 جولائی 2003ء میں آیت اللہ سیستانی ایک بار پھر سیاسی منظر نامے پر ظاہر ہوئے اور انتخابات کے طریقۂ کار کے بارے میں ایک مفصل بیان جاری کر کے متحیر کر دیا۔ جون میں جاری کئے گئے فتوے کے ضمن میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ ووٹ دینے والوں کی اہلیت اور نمائندگان کے انتخاب کے بارے میں وہ کیا کہنا چاہیں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ مجلسِ آئین ساز کے ارکان ''ووٹ کی اہلیت رکھنے والے عراقی شہریوں کی مرضی سے منتخب ہونے چاہئیں'' اور یہ کہ ''ووٹنگ کی شرائط و مقررات کا تعین کر کے سب پر شفاف انداز میں ایک جیسا اطلاق کیا جائے۔'' آگے چل کر انہوں نے کہا کہ مشرقی تیمور میں اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی اسی قسم کے انتخابات کا انعقاد کیا گیا تھا اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ''عراق کے معاملے میں اس قسم کا بندوبست کیوں نہیں کیا جاسکتا؟'' انہوں نے واضح کیا کہ ''بلاواسطہ انتخابات کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔'' آئین کی اشاعت کے بعد انتخابات ہونے کا انتظار کرنا ممکن نہیں ہو گا کیوں کہ ایک ایسی مجلس کے ہاتھوں لکھا گیا آئین ''جو عوام کی طرف سے منتخب نہیں کی گئی، قابلِ قبول نہیں ہو گا۔'' انہوں نے کہا کہ ان کا کام تو بس ''عراقی عوام کو کسی تاخیر یا لیت و لعل کے بغیر حقِ حکمرانی واپس دلوانے کا راستہ ہموار کرنا ہے۔''[13][النصوص الصادرہ، صفحہ 40،41]

آیت اللہ سیستانی کے فتوے سے بریمر کے قدم لڑکھڑا گئے، اگرچہ وائسرائے کو آیت اللہ سیستانی کی غیر رسمی طاقت کا درست اندازا لگانے میں کئی ماہ اور لگے۔ 13 جولائی 2003ء میں سی پی اے نے پچیس ارکان پر مشتمل عراقی گورننگ کونسل کا اعلان کیا جسے عراقی ریاست کی تعمیرِ نو کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس میں ملک کے بڑے نسلی اور مذہبی گروہوں کی نمائندگی تھی (تیرہ شیعہ، پانچ سنی عرب، پانچ سنی کرد، ایک آشوری مسیحی اور ایک ترکمانی)۔ بعد میں تین خواتین کو بھی شامل کیا گیا۔ اگرچہ اس کا مقصد عراقی عوام کی نمائندگی کرنا تھا، اس میں فرقہ وارانہ اور نسلی تنوع کی عکاسی کی گئی۔ مزید یہ فرض کیا گیا تھا کہ سیاسی نمائندگی یوں حصوں میں بٹی ہونی چاہئیے۔ خلاصہ یہ کہ عراقی گورننگ کونسل دراصل عراق کے بارے میں خود عراقی عوام کے بجائے سی پی اے کے زاویۂ نگاہ کی ترجمانی کرتی تھی۔ شاید بریمر کا خیال تھا کہ اس طرح کی ''نمائندہ'' مجلس ایک مقبول بندوبست ہو گی۔ وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے تھے۔ پچیس میں سے چوبیس ارکان آیت اللہ سیستانی سے ملنے نجف چلے گئے اور ہر ایک نے ان کی اس بات کو مان لیا کہ انتخابات سے پہلے کوئی عبوری آئین نہ لکھا جائے۔

آیت اللہ سیستانی اور دوسروں کے دباؤ کے نتیجے میں بریمر کو یہ ماننا پڑا کہ عراقی گورننگ کونسل محض ایک عبوری حکومت ہو گی جس کا کام موقت طور پر انتظامی معاملات کو سنبھالنا اور سی پی اے اور اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندوں کے ساتھ ایک مشاورتی اور تعاونی کردار ادا کرنا ہو گا۔ سی پی اے کے چھٹے فرمان کے مطابق سی پی اے اور عراق گورننگ کونسل کو تمام معاملات میں باہمی تعاون اور مشاورت سے چلنا تھا۔ عراقی گورننگ کونسل، جو بظاہر عراق کی آبادی کی نمائندگی کرتی تھی، نے انتخابات کے انعقاد، آئین لکھے جانے اور مستقل حکومت کے بننے تک ملک کا انتظام سنبھالنا تھا۔ لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ ایسے مقبول ادارے بنانا مشکل تھا جن کی جڑیں عراقی معاشرے میں پیوست ہوں اور امریکی تسلط کے زیر سایہ ریاست سازی کا عمل مشکلات میں گھرا رہے گا، اور اس پہ طرّہ یہ کہ آیت اللہ سیستانی ان مسائل پر نکتہ

چینی کریں گے۔ اگرچہ رسمی طور پر طاقت بریمر کے ہاتھ میں تھی لیکن غیر رسمی سیاست ان سوالوں کے گرد گھومتی تھی۔

آیت اللہ سیستانی کی دلچسپی نئی ریاست کی عوامی مقبولیت میں تھی۔ جیسا کہ اپنی کتاب کے چوتھے باب میں میں اشارہ کر چکی ہوں، وہ سیاست کی تفصیلات سے خود کو دور رکھتے تھے، اور امریکہ، کہ جس کو ہمیشہ وہ ''قابض طاقت'' کہتے تھے، سے بھی فاصلہ قائم رکھتے تھے۔ اس عرصے میں ان سے سوال کیا گیا کہ کیا انہیں عراقی گورننگ کونسل میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے اور کیا وہ امریکہ سے مذاکرات کر رہے ہیں؟ ان کے دفتر نے اس کونسل میں شرکت کے امکان کو رد کیا اور کہا کہ ''مرجع عالی اور قابض حکومت کے درمیان اس کونسل کی تشکیل یا عراق سے تعلق رکھنے والے کسی موضوع پر کوئی رابطہ نہیں ہے'' اور یہ کہ ان تک اس کونسل کے بارے میں ''کوئی معلومات نہیں پہنچائی گئیں۔'' [14] [النصوص الصادرہ، صفحہ 42]

دوسرے بیانات میں آیت اللہ سیستانی نے کہا کہ وہ ''امریکہ کے مقاصد کے بارے میں تشویش کا شکار ہیں۔'' [15] [النصوص الصادرہ، صفحہ 33] جب بھی پوچھا گیا کہ کیا انہوں نے بش انتظامیہ سے بات چیت کی ہے تو ان کا جواب نفی میں تھا۔ درحقیقت انہوں نے کبھی امریکہ کا نام استعمال نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ''قابض طاقت'' یا ''قابض حکومت'' کی اصطلاح استعمال کی۔ انہوں نے کئی مواقع پر واضح کیا کہ یہ القاب ان کا فتویٰ نہیں تھے بلکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی رسمی اصطلاحات تھیں (جنہیں بریمر بھی استعمال کر چکے تھے)۔ [16] [النصوص الصادرہ، صفحہ 45] وہ اکثر امریکی اقدامات پر تبصرہ کرنے یا امریکیوں کو اپنی غلطیوں کی اصلاح پر مشورہ دینے سے گریز کرتے تھے۔ وہ امریکہ کے بارے میں بہت کم

بولے، اسی طرح جیسے انہوں نے مقتدیٰ الصدر یا جہادی گروہوں کو رسمی شناخت دینے سے انکار کیا تا کہ وہ اپنی حد میں رہیں۔

آیت اللہ سیستانی کی فکر میں اقوام متحدہ کا ادارہ کافی نمایاں ہے۔ (عرض مترجم: اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ بین الاقوامی امورِ حسبہ کی مدیریت کرتا ہے)۔ اپنے تمام بیانات میں آیت اللہ نے واضح کیا کہ ''عبوری دور میں عراق کے امن اور استحکام کی ذمہ داری اقوام متحدہ پر ہے'' اور یہ کہ عراقیوں کو اپنے ملک پر ''حقِ حاکمیت'' لوٹانے کو ممکن بنانے کے مراحل پر ''نظارت'' اور ''نگرانی'' کے سلسلے میں اس ادارے کا کردار بہت اہم ہے۔ [17] [النصوص الصادرہ، صفحہ 58] انہوں نے ہمیشہ تصریح کی کہ عراق میں موجود تمام افواج کو ''اقوام متحدہ کی چھتری تلے'' ہی کام کرنا چاہیئے۔ [18] [النصوص الصادرہ، صفحہ 65] چونکہ سلامتی کونسل نے حملے اور قبضے کی اجازت نہیں دی تھی، لہذا آیت اللہ سیستانی کیلیئے اس بات کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ بعد میں اقوام متحدہ نے عراق میں اپنے اہلکار بھیجے۔ جب بھی ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ امریکی موجودگی کی تائید کرتے ہیں تو وہ کہتے ''ہم کیسے قبضے کی تائید کر سکتے ہیں؟'' [19] [النصوص الصادرہ، صفحہ 71] اور یہ کہ وہ امریکی افواج اور اس کے اتحادیوں، جیسے پولینڈ، کی افواج میں ''کسی فرق کے قائل نہیں ہیں۔'' [20] [النصوص الصادرہ، صفحہ 63] یہ سب عراق کیلیئے اس وجہ سے اجنبی تھے کہ یہ ایک ایسے فوجی حملے کا حصہ بنے جسے آیت اللہ خود اور عالمی برادری ناجائز سمجھتی تھی۔ جب عراق میں جاپانی فوج کی ممکنہ آمد کے بارے میں سوال کیا گیا تو آیت اللہ سیستانی نے جواب میں کہا: ''عراقی عوام اس کی آمد کو اسی صورت خوش آئند سمجھ سکتے ہیں اگر یہ عمل اقوام متحدہ کی چھتری تلے انجام دیا جائے'' اور اگر یہ ''عام انتخابات کیلیئے حالات کو سازگار بناتی ہیں۔'' [21] [النصوص الصادرہ،

صفحہ 47](لیکن جاپان نے بھی اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر اپنے دستے بھیجے۔) آیت اللہ نے ہمیشہ اقوام متحدہ کو قانونی اعتبار کی علامت کے طور پر پیش کیا۔

آیت اللہ سیستانی سے بارہا عراق سے امریکی افواج کے انخلا کے وقت اور اس میں اقوام متحدہ کے کردار کے بارے میں سوال کیا گیا۔ وہ معمولاً اس بات سے آغاز کرتے کہ روزِ اول سے ہی امریکی موجودگی ناجائز تھی، جس کی وجہ سے کسی بھی دورانیے کا قبضہ جائز نہیں ہے۔ اگر ملک کے تحفظ کیلئے بیرونی افواج کی ضرورت ہے تو آیت اللہ سیستانی کے نزدیک یہ کام اقوام متحدہ کے ''زیرِ سایہ'' ہونا چاہئیے۔[22] [النصوص الصادرہ، صفحہ 65] اس کے علاوہ کوئی طریقہ جائز نہ ہوگا۔ وہ عراق میں فرانس کے کردار سے راضی تھے کہ انہوں نے اقوام متحدہ کے راستے سے کام کیا تھا جو ان کے مطابق ''عراقی عوام کے مفادات سے ہم آہنگ تھا۔''[23] [النصوص الصادرہ، صفحہ 65] پروفیسر جولیون ہوورث نے بھی فرانس کو اس کی عالمی معاہدے کرنے کی صلاحیت اور اقوام متحدہ کی مرکزیت پر زور دینے اور عراق پر حملے سے پہلے تفتیش کے عمل کیلئے عالمی برادری کی حمایت اکٹھی کرنے کی وجہ سے ''بین الاقوامی قانون کا مدافع'' قرار دیا تھا۔[24]

آیت اللہ سیستانی نے عراق کی بابت اقوام متحدہ کی ذمہ داریوں پر بھی بہت توجہ دی۔ انہوں نے یہ استدلال قائم کیا کہ چونکہ اقوام متحدہ نے نئی عراقی ریاست کو تسلیم کر لیا تھا، اسے یہاں کے سیاسی عمل پر اس وقت تک نظارت بھی کرنی چاہئیے جب تک اس کو استحکام اور عوامی مقبولیت حاصل نہ ہو جائے۔ [25][النصوص الصادرہ، صفحہ 101] یہاں اور دوسرے مواقع پر ان کی زبان میں ابہام تھا لیکن ایک خاص منطق ان کے بیانات میں مشترک تھی: مشروعیت تبھی حاصل ہوگی جب سیاسی ڈھانچہ ''ہر فرقے

اور نسل سے تعلق رکھنے والے عراقیوں کی منشا'' کے مطابق قائم ہو جائے گا۔[26][النصوص الصادرہ، صفحہ 22]

## عراق کی خود مختاری کی طرف سفر

نومبر 2003ء میں سی پی اے نے عراق کی خود مختاری کی طرف حرکت کا منصوبہ پیش کیا۔ 15 نومبر کو جس معاہدے پر دستخط کئے گئے اس میں ٹرانزیشنل ایڈمنسٹریٹو لاء (عبوری انتظامی دستور) کا مسودہ بھی شامل تھا جو ایک موقت قانون تھا، اور عراق کے ہر صوبے میں ایک رائے شماری کی تجویز تھی تاکہ عبوری پارلیمان بنائی جائے۔ وہ پارلیمان جون 2004ء کو عبوری حکومت کا سربراہ چنے گی۔ آیت اللہ سیستانی نے تشویش کا اظہار کیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ معاہدے سے قبضے کے تسلسل کا تاثر ملتا تھا جس کا مطلب اسے جائز ماننا بھی تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ عبوری پارلیمان انتخابات کے بجائے رائے شماری سے چنی جانی تھی۔ آیت اللہ سیستانی نے جون میں فتویٰ دے کر انتخابی جمہوریت کی بات تو منوالی تھی لیکن بریمر اس فتوے میں موجود طریقہ کار پر عمل نہیں کر رہے تھے۔[27] آیت اللہ سیستانی نے کئی پیغامات میں بلا واسطہ عام انتخابات کے طریقے پر زور دیا تھا لیکن بریمر سن نہیں رہے تھے، یا یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ جو چاہیں گے کر لیں گے۔ اب آیت اللہ کو یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ رائے شماری سے اس قسم کے افراد چنے جا سکتے ہیں جو ''قوم کے منتخب کردہ بچے'' نہ ہوں۔ انہوں نے اس اصطلاح کے ساتھ ''بیلٹ باکس'' کی اصطلاح پر زور دینا شروع کر دیا تاکہ ریاست کی تشکیل کے عمل میں سابقہ تارکین وطن کے غیر متناسب اثر ورسوخ اور ایک غیر ملکی قابض قوت کے تسلط کو نمایاں کریں۔ آیت اللہ سیستانی نے کہا کہ ''یہ طریقۂ کار ناجائز ہے۔''[28][النصوص الصادرہ، صفحہ 53] مقامی جمہوریت کا بیانیہ ان کا بہترین ہتھیار ثابت ہوا۔[29]

آیت اللہ سیستانی نے ''ایک فرد، ایک ووٹ'' کے نظام کا مطالبہ کیا جس میں اظہار رائے کا میدان وسیع تر ہو گا جو اس اہم عبوری دور کیلئے ضروری ہے۔ 27 نومبر 2003ء کو آیت اللہ سیستانی نے عوام کے حقِ خود ارادیت کے بارے میں اپنا فتویٰ ایک صحافی انتھونی شدید کو دیا: ''عبوری مقننہ کے ارکان کے چناؤ کا طریقہ ایک ایسی پارلیمان کی تشکیل کو یقینی نہیں بنا سکتا جو عراقی عوام کی صحیح نمائندگی کر سکتی ہو۔'' انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ طریقۂ کار کو ''ایک ایسے طریقے سے بدلنا چاہئیے جو اس کو یقینی بنائے، یعنی انتخابات!'' صرف یہی چیز ایک ایسی پارلیمان کے وجود میں آنے کی یقین دہانی کرا سکتی ہے جو ''عراقی عوام کے ارادے کا مظہر ہو گی اور ان کی صحیح انداز میں نمائندگی کر سکتی ہو گی اور اسی طرح اس کی مشروعیت کا بھی تحفظ ہو گا۔''[30][النصوص الصادرہ، صفحہ 84]اسی فتوے میں آیت اللہ سیستانی نے انتخابات میں ووٹرز کے شناختی کارڈ نہ ہونے کی صورت میں ان کے راشن کارڈ کو شناخت کیلئے استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

15 نومبر کے معاہدے پر قائم رہتے ہوئے امریکہ نے کہا کہ ایسے آزاد اور شفاف انتخابات کی تیاری کیلئے وقت کافی نہیں ہے جو 30 جون 2004ء سے پہلے اقتدار ایک عبوری عراقی حکومت کے حوالے کرنے کو ممکن بنا سکیں۔[31] آیت اللہ سیستانی نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان سے رائے طلب کی۔ اقوام متحدہ، واحد بیرونی ادارہ جس کی مداخلت کو آیت اللہ سیستانی (بین الاقوامی مقننہ کے طور پر) جائز اور منصفانہ سمجھتے تھے، کو دعوت دے کر انہوں نے تدبر کا مظاہرہ کیا جس نے انہیں دلیل کے محاذ پر پیش قدمی کرنے میں واشنگٹن پر فوقیت دی۔ بریمر کو بھی معلوم تھا کہ عراق میں قومی ریاست بنانے کے عمل میں وہ اقوام متحدہ سے بے نیاز نہ تھے۔ درحقیقت عراق پر حملے کے وقت اقوام متحدہ کی مخالفت کرنے کے باوجود اب امریکہ کو اس عالمی ادارے کی طرف واپس آنا پڑا تھا، جزوی طور پر اس لئے کہ بہت سے ملک عراق میں نئی قومی ریاست بنانے کے عمل میں اقوام متحدہ کی قرارداد کے بغیر شامل ہونے پر رضامند نہ

تھے۔ لیکن آیت اللہ سیستانی سی پی اے پر دباؤ ڈال کر یہ بات سامنے لانا چاہتے تھے کہ سی پی اے انتخابات کروانا ہی نہیں چاہتی۔ وہ مسلسل عبوری حکومت کے ناجائز ہونے اور مقامی حمایت سے محروم ہونے جیسی حقیقت کو بیان کرتے رہے۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کوفی عنان آیت اللہ سیستانی کے نام عراقی گورننگ کونسل کے صدر عدنان پچاچی کے ہاتھوں ایک خط ارسال کر چکے تھے جس میں انہوں نے جلدی انتخابات کروانے کی مخالفت میں مشورہ دیا تھا۔ آیت اللہ کیلئے کسی تحقیقاتی کمیشن بنائے اور معاملے کو پرکھے بنا دیئے گئے مشورے کی کوئی حیثیت نہ تھی چاہے اسے اقوام متحدہ نے ہی تیار کیا ہو۔ انہوں نے اقوام متحدہ پر مزید کچھ کرنے کیلئے دباؤ ڈالا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ سی پی اے کو مجبوراً اقوام متحدہ کے وفد، جس کی قیادت لاٗخضر براہیمی کر رہے تھے، سے پوچھنا پڑا کہ عبوری حکومت کیلئے جلد انتخابات کے امکان پر اپنی رائے دیں۔ آیت اللہ سیستانی نے نہ صرف امکان کا علمی جائزہ لئے جانے کا مطالبہ کیا بلکہ وفد سے چاہا کہ ''سب پہلوؤں پر تحقیق کریں'' اور عبوری قومی کونسل میں عراقی عوام کی نمائندگی کیلئے ''متبادل طریقۂ کار وضع کریں۔'' [32] [النصوص الصادرہ، صفحہ 86] بریمر کو بھی انتخابات کو 30 جون تک ملتوی کرنے کیلئے اقوام متحدہ کی حمایت درکار تھی۔

بڑے پیمانے پر تحقیق کرنے کے بعد لاٗخضر براہیمی نے نتیجہ نکالا کہ انتخابات سال 2004ء کے اواخر یا سال 2005ء کے اوائل میں ہی منعقد ہو سکتے ہیں۔ آیت اللہ سیستانی نے فیصلے کو قبول کر لیا۔ اپنے بیان میں انہوں نے کہا: ''(اقوام متحدہ کی) رپورٹ نے جامع حکومت کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا ہے جو بلا واسطہ قومی انتخابات پر مبنی ہو گی''۔ آگے چل کر انہوں نے کہا کہ اس رپورٹ نے 15 نومبر کے معاہدے میں موجود ''اہم نقائص'' کی نشاندہی کی، اور پھر انہوں نے ان نقائص کو ایک ایک کر کے لکھ دیا۔ انہوں نے نتیجہ نکالا کہ اب عبوری حکومت کا کام عارضی قوانین بنانا رہ گیا تھا اور یہ ''غیر منتخب سرکار'' 2005ء کو ختم ہو جائے گی۔ [33] [النصوص الصادرہ، صفحہ 106] انہوں نے اقوام متحدہ

سے اس عمل پر نظارت کی ضمانت حاصل کر لی۔ اس بیان نے اس بات کو بھی یقینی بنا دیا کہ امریکی اقدامات کی بابت اقوام متحدہ کی تشخیص عوام میں نشر ہو جائے۔

تاہم آیت اللہ سیستانی حد سے زیادہ مخالفت نہیں کرتے تھے۔ در حقیقت انہوں نے امریکہ کے ریاست سازی کے منصوبے کو سبوتاژ نہ کر کے ایک اعتبار سے اسکی مدد بھی کی۔ جس وقت انہوں نے اقوام متحدہ کی سفارشات کو منظور کیا، بصرہ میں عوام ان کے جلد انتخابات کروانے کے مطالبے کے حق میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ کئی مظاہرین نے بینروں پر ''کلا کلا امریکہ'' کے نعرے لکھ رکھے تھے۔ اس اعلان سے پہلے آیت اللہ سیستانی کے دفتر کے ایک عہدیدار نے امریکیوں سے کہا تھا کہ وہ مجوزہ عبوری حکومت کے خلاف ایک فتویٰ جاری کرنے پر غور کر رہے ہیں۔ البتہ امریکہ اپنے منصوبوں کو بدلنے میں تامل کا شکار تھا، اس بات کو اہمیت دیئے بنا کہ جنگ کے آغاز میں آیت اللہ سیستانی کے ہی ایک فتوے نے صدام کی شکست کو تیز تر کیا تھا اور اگر آیت اللہ چاہتے تو امریکہ کی مشکلات میں اضافہ کر سکتے تھے مگر وہ جانتے تھے کہ کمزور عراقی حکومت امریکی مدد کے بغیر کام نہیں کر سکے گی۔ امریکی حملے پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے مقلدین کو قانون کی پاسداری، لڑائی اور لوٹ مار سے دوری اور جہادی تنظیموں میں شمولیت سے پرہیز کی نصیحت کی تھی۔ وہ ہمیشہ سماجی ضابطے میں رہ کر کام کرتے تھے۔

8 مارچ 2004ء کو ٹرانزیشنل ایڈ منسٹریٹو لاء (عبوری انتظامی دستور) منظور ہوا جو نئی حکومت کے قیام تک موثر رہا اور مئی 2006ء میں بننے والے مستقل آئین نے اسکی جگہ لی۔ اسے صدام کی شکست کی پہلی برسی کے موقع پر عراقی اور امریکی قیادت کی طرف سے ایک بڑی کامیابی گردانا گیا۔ یہ ایک مثالی دستاویز تھی کہ جس میں کلی نکات بیان کئے گئے تھے جو لکھنے والوں کے خیال میں مستقل آئین کے رہنما اصول بنیں گے۔ اس میں جدید ریاست کے بہت سے عناصر ترکیبی تھے، جیسے: حقوق کا بیان، فوج پر عوامی بالا دستی، احتساب کا نظام، وغیرہ۔ اس میں انسانی حقوق کے تحفظ اور جمہوریت کے احترام کی شقیں شامل کی

گئی تھیں۔ اس میں ریاست کی مختلف شاخوں میں اختیارات کی تقسیم اور قانون کی حکومت کی تعریف بیان کی گئی تھی۔ اس میں مفاہمت کا پہلو بھی تھا: عربی کے علاوہ کردی زبان کو بھی رسمی زبان قرار دیا گیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ کرد قومیت کو بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ کرد جمہوری پارٹی کے سربراہ مسعود بارزانی نے کہا کہ آئین نے کردوں کو برابر کا شہری ہونے کا احساس دلایا ہے، نہ دوسرے درجے کے شہری ہونے کا، اور اپنے لوگوں کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کردی زبان میں تقریر چھوڑ کر عربی بولنے لگے۔[34]

اگرچہ آیت اللہ سیستانی عبوری حکومت کو ناجائز کہنے پر مصر تھے لیکن انہوں نے اپنی توجہ عبوری انتظامی دستور کی تفصیلات کی جانب مبذول کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے خدشات کی جزئیات بیان کرنے لگے۔ ایک خدشہ یہ تھا کہ ''گروہی مفادات کی مداخلت'' آئینی عمل کی مقبولیت کو کم کر دے گی۔ [35] (بل ان من المؤکدان المصالح الشخصیۃ والفئویۃ و العرقیۃ والحسابات الحزبیۃ والطائفیۃ ستتدخل بصورۃاوباخری فی عملیۃالاختیار، ویکون المجلس المشکّل فاقداًللشرعیہ[النصوص الصادرہ، صفحہ 76])مثال کے طور پر عبوری انتظامی دستور میں صدارتی شوریٰ بنائی گئی جو تین ارکان؛ ایک کرد، ایک سنی عرب اور ایک شیعہ عرب؛ پر مشتمل ہوگی۔ یہ نسلی اور مذہبی اختلاف کو نمایاں کرنے والا ڈھانچہ تھا جو عراق کو فرقہ پرست حکمرانی کی دلدل میں پھنسانے کیلئے کافی تھا۔ آیت اللہ سیستانی نے تنبیہ کی کہ نسلی اور مذہبی گروہ بندی سے چپک جانے سے شوریٰ فیصلے کرنے کے قابل نہ رہے گی اور ''ملک کے اتحاد'' کو نقصان پہنچے گا۔

[36][النصوص الصادرہ، صفحہ 110]

آیت اللہ سیستانی نے اقوام متحدہ سے رجوع کیا اور اس فرقہ وارانہ تقسیمِ اقتدار کے خلاف احتجاج کیا جسے انہوں نے تمام عراقیوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والا عمل قرار دیا۔ انہوں نے لأخضر براہیمی کے نام خط لکھا جس میں ایک ایک کر کے اپنی شکایات بیان کیں۔ اس بار ان کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ انہوں

نے کہا کہ عبوری انتظامی دستور پر بہت سی ''قیود'' عائد کی گئی ہیں اور شقوں کو اس پر ''تھونپا'' گیا ہے جو ''بہت خطرناک'' طرزِ عمل ہے کہ جس کا ازالہ کرنا ہوگا۔ صدر کے عہدے پر (تین افراد کی) شوریٰ کو بٹھانا عوام کی خواہشات کے مطابق نہیں ہے جیسا کہ ''رائے عامہ کے بارے کی گئی اندازہ گیری اور دستخطی مہم میں لاکھوں افراد کی شرکت'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن میں یا تو عبوری دستور کو مسترد کیا گیا ہے یا اس میں تبدیلیوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ بات کہ ''جب تک تینوں ارکان میں اتفاق نہ ہو''، جو کہ اختلاف رائے کی صورت میں بعید تھا، صدارتی شوریٰ کو کوئی قدم اٹھانے کے لائق نہ چھوڑے گی۔ تعطل کا لازمہ بیرونی قوت، جیسے امریکہ، کی مداخلت ہوگا۔ آیت اللہ سیستانی نے خبردار کیا کہ نسلی اور مذہبی تفریق پر مبنی نظام مستقبل میں عراق کے ''عدم استحکام، تقسیم اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے'' کا سبب بنے گا۔[37] [النصوص الصادرہ، صفحہ 111تا113] تاہم انہوں نے عبوری انتظامی دستور کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ بظاہر اس وقت وہ مذاکرات کے ذریعے اپنا ہدف حاصل کرنا چاہتے تھے۔

آیت اللہ سیستانی نے بریمر کی اس بات میں خاص طور پر مخالفت کی کہ عراق میں آزاد اور شفاف انتخابات کیلئے 30جون 2004ء کی ڈیڈ لائن تک مناسب حالات پیدا نہیں ہو سکتے۔ آیت اللہ نے اس کے برعکس کے حق میں دلائل اکٹھے کئے۔ مثال کے طور پر صدارتی شوریٰ کی تجویز کے خلاف اندازہ گیری کا عمل اور عراقی معاشرے میں گردش کرنے والی عرضداشتیں عراقی عوام کے سیاسی بلوغ کا اظہار تھیں۔ یوں آیت اللہ نے ثابت کیا کہ وہ ملکی سیاست کے رجحانات سے باخبر تھے۔ انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ عالمی برادری کو عبوری انتظامی دستور کو تسلیم نہیں کرنا چاہئیے اور کہا کہ یہ بات اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل تک بھی پہنچائی جائے۔[38] [النصوص الصادرہ، صفحہ 111تا113] اقوام متحدہ میں قرارداد نمبر 1546 کی منظوری سے قبل جون میں ایک اور خط لکھ کر انہوں نے جہاں جنوری 2005ء تک قومی انتخابات اور خود مختاری کی واپسی کے احتمال کو خوش آئند قرار دیا وہیں بڑے واضح الفاظ میں عبوری انتظامی

دستور کا ذکر قرارداد میں شامل نہ کئے جانے کا مطالبہ کیا، کیوں کہ یہ ایک عارضی دستاویز تھی جو ''غیر ملکی قبضے کے دوران لکھی گئی'' تھی اور ''(بین الاقوامی) قانون کے خلاف'' تھی اور ''عوام کی اکثریت کی طرف سے مسترد شدہ'' تھی۔[39][النصوص الصادرہ، صفحہ 112] فی الواقع قرارداد نمبر 1546 میں عبوری انتظامی دستور کا کوئی ذکر نہ کیا گیا۔

بنیادی طور پر آیت اللہ سیستانی نے عبوری انتظامی دستور کو وقتی طور پر اس لئے مشروع سمجھا تاکہ مملکت کی وحدت کو قائم رکھا جاسکے اور عام انتخابات کی تاریخ طے کرنے اور حتمی آئین کی تیاری جیسے اہداف کی طرف سفر جاری رکھا جاسکے۔ تاہم ابھی کچھ مسائل موجود تھے۔ اس عارضی دستور میں وفاقی طرز کا ڈھانچہ پیش کیا گیا تھا: دراصل یہ عراق کو ایک وفاقی ریاست قرار دیتا تھا جس میں قابلِ ذکر اختیارات صوبوں کو منتقل کئے گئے تھے۔ دوسروں کی مخالفت کے باوجود کرد نمائندے عارضی دستور میں یہ شق شامل کرنے میں کامیاب رہے تھے کہ کوئی سے تین صوبے دو تہائی اکثریت سے اگر کسی قانون کی مخالفت کریں تو وہ حتمی آئین کا حصہ نہیں بنے گا۔ چونکہ عراق کے تین صوبوں؛ سلیمانیہ، اربیل اور دہوک؛ میں کرد آبادی کی اکثریت ہے، لہٰذا اس شق نے عملاً کردوں کو حتمی آئین پر ویٹو کی طاقت دے دی، جو قومی انتخابات کے بعد لکھا جانا تھا۔ انہیں اس وقت تک پیشمرگہ (لفظی مطلب: وہ جو موت کے سامنے آتے ہیں) نامی لشکر رکھنے کی بھی اجازت دی گئی جب تک اس کی حیثیت کا تعین نہیں ہو جاتا۔ دوسرے لشکروں، جیسے شیعہ ملیشیاؤں، کی حیثیت کے بارے میں عبوری دستور میں کچھ نہ تھا۔ آیت اللہ سیستانی سبھی لشکروں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، اور صرف ریاستی عسکری اداروں کو ہی جائز سمجھتے تھے۔ (لسنا مع تشکل مثل هذه الميليشيات، وتاكيدنا على دعم القوة الوطنية العراقية [النصوص الصادرہ، صفحہ 71])عبوری دستور میں یہ شق بھی شامل تھی کہ 2005ء کے آغاز میں انتخابات سے پہلے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکے گی۔[40]

آیت اللہ سیستانی نے اس معاملے پر ملی نکتہ نظر سے بات کی، جو باقی مسائل پر ان کے موقف سے ہم آہنگ تھی۔ وہ طاقت کی تقسیم اور اس سے مملکت کی وحدت کو لاحق خطرات پر پریشان تھے۔ آیت اللہ سیستانی کی نظر میں ''کردوں'' اور ''سنیوں'' کو آئینی طور پر غیر بنانے سے بھی بڑا خطرہ ملی شیرازہ بکھرنے اور وطن کی تقسیم کا تھا۔ یہ منہج ان کے عراق محور طرزِ فکر کے ساتھ ہم آہنگ تھی جو وہ 2003ء سے اپنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ضبطِ نفس کا شاندار مظاہرہ کیا، اگرچہ کردوں نے نئے سیاسی بندوبست میں اپنے حق سے زیادہ طاقت حاصل کر لی تھی۔ وہ وفاق سے متعلق سوالات پر یا تو غیر جانبدار رہے یا جواب دینے سے پرہیز کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا: ''وفاقیت کی اساس اور اسکی موزوں اقسام پر عراقی عوام کی رائے سے فیصلہ ہوگا'' اور ''اس وقت تک کسی تشہیر سے اجتناب برتا جائے گا۔'' وہ اس عمل پر اثر انداز ہونے سے گریز کر رہے تھے۔ انہوں نے قارئین کو یقین دہانی کرائی کہ جن ماہرین کو کام سونپا جائے گا وہ ''عراق کی وطنی وحدت اور اس کی سب قومی اکائیوں اور نسلی گروہوں کے حقوق کے تحفظ کا بہترین قاعدہ'' ڈھونڈ نکالیں گے۔ [41] [النصوص الصادرہ، صفحہ 100 تا 103] انہوں نے فرقہ واریت کی مخالفت اور ملی وحدت کو ہر ممکن وسعت کے ساتھ بیان کر دیا۔ اسی طرح جمہوریت کے بارے میں ان کی گفتگو ہمیشہ سب کو شامل کرنے والی ہوتی تھی اور انہوں نے کبھی کسی گروہ کو براہ راست اپنا مخاطب قرار نہ دیا۔ جب ان پر شیعہ اکثریت کے بارے میں تبصرہ کرنے کیلئے دباؤ ڈالا گیا، جو واضح عددی اکثریت کے بل بوتے پر حاکم گروہ بن سکتے تھے، آیت اللہ سیستانی نے سب شیعوں کو ایک جیسا اور باقیوں سے الگ گروہ سمجھنے کی مخالفت کی۔ انہوں نے کسی امتیاز کے بغیر (شہری کی حیثیت میں) شیعوں کو باقی عراقیوں کے برابر قرار دیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ شیعوں کی ضروریات ''باقی عراقی شہریوں جیسی'' تھیں جن میں ''کسی فرقہ وارانہ امتیاز کے بغیر حقوق کا پورا ہونا'' شامل تھا۔ [42] (انّ ما یریدہ الشیعۃ فھو لایختلف عما یریدہ سائر الشعب العراقی [النصوص الصادرہ، صفحہ

45] )انہوں نے کسی قسم کی عسکری تنظیم بنانے کی مخالفت کی، چاہے اس کا مقصد مقدس شہروں کی حفاظت ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے درجنوں فتوے تمام عسکریت پسند گروہوں کو غیر شرعی ہونے پر جاری کئے۔[43][النصوص الصادرہ، صفحہ 51] جہاں تک طرزِ حکمرانی کی بات تھی، انہوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ سب کو مل کر، سیاسی وابستگی سے بالاتر ہو کر اور ملی استقلال کو مد نظر رکھ کر، کرنا ہو گا۔ یہی پلاٹنر صاحب کے نظریۂ جمہوریت کی روح ہے۔

آیت اللہ سیستانی کوئی تجربہ کار سیاست دان نہ تھے لیکن وہ ایک سیاسی حس رکھتے تھے جس سے وہ ریاست کی بنیاد بننے والی دستاویز اور اداروں کے گہرے مضمرات کو سمجھ سکتے تھے۔ اے جی سی اور عبوری انتظامی دستور کی ساختاری فرقہ واریت نے ملکی سطح پر بھی اور خطے میں بھی اثرات مرتب کرنے تھے۔ یہ 2004ء کے ابتدائی ایام تھے جب عبوری انتظامی دستور نافذ ہوا، اور اس وقت وطن کی سلامتی کو خانہ جنگی یا دہشتگردی کے خطرات لاحق ہونے کی بات کوئی نہیں کر رہا تھا لیکن آیت اللہ سیستانی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ریاست کی تشکیل میں چھپے خطرات کی پیش بینی کرنے میں کامیاب رہے۔ البتہ وہ اس میں تنہا نہ تھے: خطے کے ماہرین نے لبنانی طرز کی تقسیم اقتدار کی خامیوں اور اس کے عراق کیلئے خطرناک ہونے کے بارے میں پہلے سے مقالے لکھ رکھے تھے۔ بطورِ کلی تقسیم کی بابت آیت اللہ سیستانی کے انتباہات کا رخ کردوں کی جانب نہیں بلکہ ریاست کی سالمیت اور آئینی عمل کی مقبولیت کی طرف تھا۔ درحقیقت ان کے بیانات کا بیشتر حصہ فرقہ وارانہ جنگ کے خطرات کے بارے میں ہوتا تھا جو آگے چل کر عراقی ریاست کو لاحق ہونے والے تھے۔ شیعہ سنی تقسیم کے بارے میں ان کے خیالات کی بنیاد یہ تھی کہ: ''اگر بیرونی ہاتھ عراق کے معاملات میں دخل نہ دے تو عوام آپس میں بہتر طریقے سے ہم آہنگ اور یکسو ہو جائیں گے۔''[44][النصوص الصادرہ، صفحہ 65] آیت اللہ سیستانی نے ریاست کا شیرازہ بکھرنے کے بارے میں پہلے سے انتباہ کر دیا تھا کیوں کہ وہ عبوری ڈھانچے اور عملی تشدد میں موجود تعلق کو سمجھ رہے تھے،

اسلئے نہیں کہ وہ کسی خاص نسلی گروہ کے مخالف تھے۔ ان کا پیغام کسی کے خلاف نہ تھا: وہ گروہ جنہیں سیاسی عمل میں حصہ نہ دیا گیا وہ تشدد کا راستہ اختیار کر رہے تھے۔ یہ نسخہ سانحے کو ہی جنم دے سکتا تھا۔

## انتخابات اور ایک نیا آئین

30 جنوری 2005ء کو انتخابات کی تاریخ قرار دیئے جانے کے بعد آیت اللہ سیستانی نے دوبارہ اپنی توجہ سیاست پر مرکوز کی۔ بہت کچھ داؤ پر لگ چکا تھا۔ دو سو پچھتر رکنی پارلیمان نے دائمی آئین تدوین کرنا تھا اور 15 اکتوبر 2005ء میں ریفرنڈم کے ذریعے نئے آئین کی توثیق تک عبوری حکومت بنا کر سب آئینی ذمہ داریاں پوری کرنی تھیں۔ اس کے بعد دسمبر 2005ء میں مستقل آئین کے تحت پہلی پارلیمان بنائے جانے کیلئے دوبارہ انتخابات ہونے تھے۔ 10 اکتوبر 2004ء کو آیت اللہ سیستانی سے ان کے مقلدین نے سوال کیا کہ انتخابات کے معاملے میں ان کی ذمہ داری کیا ہے؟ انہوں نے جوابی فتوے میں بتایا کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے تمام مرد و خواتین شہریوں سے کہا کہ وہ ووٹر لسٹ میں اپنے نام کے اندراج کی تصدیق کریں، اور اس کام میں ایک دوسرے کی مدد کیلئے انجمن سازی کی تلقین کی اور کہا کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ''ہر عراقی شرکت کرے۔'' [45] (بمشارکۃ جمیع العراقیین [النصوص الصادرہ، صفحہ 131]) عراقی سماج پر تحقیق کرنے والے ایک ماہر کے مطابق یہ ''عوامی جمہوریت کیلئے علمائے دین کے اعلیٰ ترین عزم کا اظہار تھا جس کی عراق کی حالیہ تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔'' [46] اس 'ووٹ دو' فتوے میں صرف مقلدین کے بجائے سب عراقیوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔

آیت اللہ سیستانی نے ووٹ دینے کو شرعی ذمہ داری قرار دیا۔ انکی دلیل یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے تمام عراقیوں کو ایک ایسی ریاست بنانے کیلئے مل کر چلنے کا موقع ملے گا جس میں سب برابر ہوں، جس کیلئے وہ ایک سال سے انتھک کوشش کر رہے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے، ماضی کے برعکس، بار بار فتویٰ جاری نہ کیا۔ سیاسی عمل کی جزئیات میں مداخلت سے پرہیز کے عزم پر ثابت قدم رہتے ہوئے انہوں نے واضح کیا

کہ وہ راستہ ہموار کریں گے مگر سفر پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ اس طرح اکتوبر میں دیا گیا فتویٰ سب عراقیوں سے انتخابات میں شرکت کی درخواست تھی۔ جب جنوری 2005ء کے انتخابات نزدیک آ گئے تو یہ امید کی جا رہی تھی کہ آیت اللہ سیستانی ایک اور بیان جاری کریں گے یا کم از کم شیعہ تنظیموں کے اتحاد، ائتلاف العراقي الموحد، کی حمایت کریں گے۔[47] وہ اپنا وزن ان کے پلڑے میں ڈال کر بادشاہ گر بن سکتے تھے۔ لیکن اگر انہوں نے اس اتحاد کی حمایت کا اعلان کیا ہوتا یا جنوری کے انتخابات کی بابت فتویٰ یا فتوے دیئے ہوتے تو مبصرین اور مقامی سیاست دانوں نے ان کو شک کی نگاہ سے دیکھنا تھا، انہیں فرقہ پرست سمجھنا تھا۔ ذرائع ابلاغ نے ایسی خبریں چلائیں جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ آیت اللہ سیستانی نے ائتلاف کی حمایت کی ہے۔ لیکن ان کے اس دعوے کی تصدیق کیلئے کوئی ثبوت موجود نہیں۔[48]

یہ سوال کہ آیا آیت اللہ سیستانی ائتلاف کی حمایت کرتے ہیں یا نہیں، صحافیوں اور تجزیہ نگاروں کیلئے ایک اہم موضوعِ بحث تھا۔ بہت سے محققین اس بات پر متفق تھے کہ انہوں نے ائتلاف کی حمایت کی ہے، بلکہ فتوے کو ایک اور انداز میں سمجھا جائے تو ان کیلئے ''دعا'' کی ہے۔ تاہم اگلی سطر میں انہوں نے کہا کہ وہ انتخابات میں حصہ لینے والی سب سیاسی جماعتوں کی ''تائید'' کرتے ہیں۔ جب ان سے وضاحت طلب کی گئی تو انہوں نے کہا کہ جماعتوں کو ان کا نام یا نفوذ اپنے مفاد کیلئے استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ تاہم ان کے کئی نمائندوں اور شاگردوں نے ائتلاف کی حمایت کی، جس سے محققین نے یہ تاثر لیا کہ 2005ء میں آیت اللہ سیستانی اس کی حمایت کرنے جا رہے ہیں۔ 16 دسمبر 2004ء کو آیت اللہ سیستانی نے اس معاملے پر ایک سوال کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ وہ اس اتحاد کی کامیابی کیلئے دعا گو ہیں، لیکن وہ انتخابات میں حصہ لینے والی سب جماعتوں کی حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ انہوں نے باقی جماعتوں پر فوقیت دیتے ہوئے کسی ایک سیاسی جماعت کے حق میں کوئی فتویٰ جاری نہیں کیا اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کچھ لوگ ووٹ حاصل کرنے کیلئے ان کا نام استعمال کر رہے تھے۔[49] انتخابات کے فوراً بعد آیت اللہ سیستانی کے نمائندے حامد الخفاف نے ان کا بیان جاری کیا جس میں آئین اور سیاسی عمل کے

بارے میں افواہوں کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ انہوں نے نہ تو کوئی نیا بیان جاری کیا ہے نہ ہی ان کی ''سابقہ آراء'' میں حالیہ دنوں میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ انہوں نے مستقل آئین اور عراقیوں کی قومی شناخت کے تحفظ کے بارے میں اپنے سابقہ موقف کو باقی رکھا۔ وہ قومی اکٹھ میں عوامی نمائندوں کے ترتیب کردہ بنیادی نکات کے حامی رہے۔ ائتلاف نے اپنی انتخابی مہم کے دوران آیت اللہ کی بڑی بڑی تصاویر سب شہروں میں، یہاں تک کہ پولنگ سٹیشنوں پر بھی، آویزاں کی تھیں۔ آیت اللہ نے کہا کہ ''جو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں وہ ایسا کام نہ کریں۔''[50][النصوص الصادرہ، صفحہ 141]ان کے رد عمل کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو سیاسی عمل سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ خطے کے تمامیت خواہ آمر ہمیشہ اپنی بڑی بڑی تصویریں شہر بھر میں آویزاں کرواتے ہیں تا کہ اپنے آپ کو ظلِ الٰہی اور طلسماتی شخصیت کے طور پر منوائیں۔ یہ انداز آیت اللہ سیستانی کیلیئے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ سیاست پر اثر انداز ہونے اور اس میں عملی حصہ لینے کے بیچ موجود حد کا خیال رکھا۔ اب کچھ نہ کرنے کا وقت تھا۔

جنوری کے انتخابات جوں جوں قریب آنے لگے، ایسے وقت میں جب عراقی عوام کو پر جوش ہونا چاہیئے تھا، تشویشناک انداز میں دہشتگردی میں اضافہ ہونے لگا اور اس نے فرقہ وارانہ رنگ پکڑ لیا۔ ائتلاف اور کرد جماعتوں نے انتخابات میں واضح برتری حاصل کر لی لیکن سنی عربوں نے انتخابات میں کم حصہ لیا۔ وہ آبادی کا تقریباً20 تھے لیکن صرف دو فیصد ووٹ دینے گئے۔ سنی عرب علاقوں میں تشدد عام تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے سنی گروہوں، جیسے ہیئۃ علماء المسلمین، نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ (عرضِ مترجم: عرب عراقیوں میں اہلسنت اقلیت میں ہیں لیکن پچھلے اسی سال سے عراق میں آمروں کی حکومتوں نے ان کو خصوصی مراعات دے کر شیعہ عرب اور سنی کرد شہریوں کو محروم رکھا تھا تا کہ عوام کو تقسیم کر کے

آسانی سے حکومت کی جا سکے۔ اب صدام کے اقتدار سے الگ کئے جانے اور جمہوریت کے آنے کو سنی عربوں کی مراعات کیلئے خطرہ بنا کر پیش کیا جا رہا تھا۔)

اہلسنت عربوں کی کم شرکت نے سارے عمل کی مقبولیت کو خطرے میں ڈال دیا جس نے انتخابات جیتنے والوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ سنی عربوں کو مستقبل میں آئین لکھنے کے عمل میں شریک ہونے پر راضی کریں۔ (سنی علاقوں میں کم ووٹ کاسٹ ہونے کی وجہ سے) 275 کامیاب امیدواروں میں صرف 17 سنی عرب تھے۔ چھ ماہ بعد، جون 2005ء میں، آیت اللہ سیستانی نے انتخابی عمل میں ایسی تبدیلیاں کرنے پر زور دیا جو آئندہ بننے والی اسمبلیوں میں سنی عربوں کی کماحقہم نمائندگی کو یقینی بنا سکیں۔ آیت اللہ سیستانی نے تجاویز بھی مرتب کیں جو جنوری کے انتخابات میں اپنائے گئے نظام کا متبادل ہو سکتی ہوں۔ اس طرح قومی انتخابات میں ووٹر ملک گیر فہرستوں کے بجائے صوبائی سطح پر بننے والی فہرستوں میں سے اپنے نمائندگان چن سکیں گے۔ نئی صوبہ محور تجویز ماننے سے نشستوں کی تعداد کو آبادی کے تناسب سے ہم آہنگ کرنا ممکن ہو گا۔ اس طرح ووٹ ڈالے جانے کی شرح کا اثر نہیں ہو گا۔ آیت اللہ سیستانی نے واضح کیا کہ اس نئے انتخابی نظام کی اہمیت یہ ہے کہ یہ عراق کی نازک سیاسی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اس لئے یہ اقدام اٹھا رہے تھے کہ ماضی میں ''بہت سی غلطیاں ہوئیں۔'' ہمیشہ کی طرح آیت اللہ سیستانی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ''سب شہریوں کو'' جمہوریت میں حصہ لینا چاہئیے۔[51]

مئی میں نئی حکومت کے آغاز کے بعد آئین لکھنے والوں میں باقی ماندہ اختلافی نکات پر بحث شروع ہوئی۔ سب سے زیادہ جس نکتے پر بحث ہوئی وہ وفاقیت اور عراق کی متعدد علاقوں میں تقسیم کا خطرہ تھا۔ وفاقی طرز حکومت کے بارے میں مسودہ کردوں نے تیار کیا تھا اور مرحوم آیت اللہ باقر الحکیم کی جماعت المجلس الاعلی الاسلامی العراقی، نے اسکی حمایت کی تھی۔ آیت اللہ سیستانی نے ان بحثوں میں دخل نہ دیا اور مختلف گروہوں کو مذاکرات کرنے دیئے۔ وہ اس لئے خاموش نہ تھے کہ یہ بحث اہمیت نہ رکھتی تھی، بلکہ اس

لئے کہ گروہوں کو اپنا اختلاف خود حل کرنا تھا۔ جیسا کہ وہ امریکہ یا عراقی گورننگ کونسل کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی طرح وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں بھی مداخلت نہیں کرنی چاہئیے۔ جمہوری طور پر منتخب شدہ سیاسی جماعتوں کے سیاسی نظام کے ساتھ تعامل میں ان جماعتوں کے ارتقاء کا احتمال کافی زیادہ تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر ہوا، آیت اللہ سیستانی کی پیش بینی کے مطابق مستقل آئین کے نکات پر علاقائی اور نسلی بنیادوں پر مفاہمت پیدا ہوئی۔ سب گروہوں کے حقوق کے تحفظ کا خیال عبوری انتظامی دستور میں بھی رکھا گیا تھا، اس دستاویز کو مشہور ماہر قانون اینڈریو آراتو نے ''موزوں پیرہن'' سے تعبیر کیا تھا جس کے آگے چل کر اچھے سیاسی اثرات مرتب ہوئے۔[52]

مستقل آئین میں وفاقی طرز پر کردوں کے علاقائی خود مختاری کے بہت سے مطالبے تسلیم کئے گئے، جنہیں ''اقالیم'' کی صورت میں بیان کیا گیا۔ کردوں نے عبوری انتظامی دستور میں دیئے گئے سب اختیارات کو دوبارہ حاصل کر لیا اور ان کے علاوہ بھی مرکز پر کچھ امتیازات حاصل کر لئے۔ آئین کی شق 117 نے کردوں کے تین صوبوں دہوک، اربیل اور سلیمانیہ کو قانونی طور پر علیحدہ علاقہ تسلیم کیا جو ''حکومتِ اقلیمِ کردستان'' کے ماتحت ہوں گے۔ اس حکومت کے پاس وفاقی قوانین کے اطلاق میں تبدیلی کرنے کا حق تھا، سوائے ان مخصوص شقوں کے جو وفاق کا خاصہ ہیں، اور اس کو اپنی حفاظت کیلئے ایک نیم فوجی لشکر رکھنے کی بھی اجازت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حکومت کے پاس بیرون ملک سفارت خانے کھولنے کا حق بھی تھا۔ آئین کی شق 4 میں عربی کے ساتھ ساتھ کردی زبان کو بھی قومی زبان تسلیم کیا گیا۔ جنوری 2005ء میں جب صوبائی انتخابات ہوئے تو کردستان کی قومی اسمبلی کیلئے بھی انتخابات برپا ہوئے، جو حکومتِ اقلیمِ کردستان کی الگ پارلیمنٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ کردستان قومی اسمبلی نے 12 جنوری 2005ء کو مسعود بارزانی صاحب کو کردستان کا صدر منتخب کیا۔[53] مولانا سید عبد العزیز الحکیم، جو عراق کے جنوب میں خود مختاری کے حامی تھے، نے ایک دھماکہ دار بیان جاری کرتے ہوئے جنوب کے نو شیعہ اکثریت والے صوبوں کے لئے ایک اقلیم قائم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ وہ

ایک ایسی علاقائی اکائی کا تصور پیش کر رہے تھے جیسی کردوں کو شمال میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ وزیر اعظم ابراہیم جعفری کی سوچ سے اختلاف تھا، جو مرکز کو زیادہ طاقتور دیکھنا چاہتے تھے اور ان نو صوبوں کو الگ الگ حیثیت دینا چاہتے تھے۔[54]ان صوبوں میں عراق کی آدھی آبادی اور اسی فیصد تیل پایا جاتا ہے۔[55]اس کا مطلب تھا کہ یہ ایک شیعہ شناخت کا علاقہ بن جائے گا اور ایسی اکائی بھی بن سکتا ہے جو مرکز پر بہت زیادہ اثر ڈال سکتا ہو۔ کردوں نے طاقت کے اس ارتکاز کو رد کرنا تھا اور سنی عربوں میں یہ احساس پیدا ہونا تھا کہ وہ درمیان میں کمزور اور بے بس رہ جائیں گے۔ ان کیلئے وفاقی طرز کی ریاست میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مولانا حکیم کا پیش کردہ تصور آیت اللہ سیستانی کی خواہش سے انحراف تھا جو ریاست کے نزدیک تمام عراقیوں کی برابری کے قائل تھے۔ یہ بیان آیت اللہ کے عراق کی وحدت کے تصور سے بھی ٹکراتا تھا اور اس نے دوبارہ عراق کی ''سرد تقسیم'' کی بحث کو زندہ کر دیا۔[56]اہم بات یہ ہے کہ سید عبدالعزیز الحکیم کا تصور شیعہ سوچ کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ شیعہ عوام کی اکثریت مضبوط مرکز دیکھنا چاہتی تھی اور صرف کردوں کیلئے جزوی وفاقیت کی قائل تھی۔[57]سال بھر کیلئے بصرہ کے شیعوں میں قریبی علاقوں کی ایک اقلیم کیلئے کبھی کبھی تحریک اٹھتی رہی لیکن اس چھوٹی اکائی کے حق میں بھی عوامی حمایت بہت کم رہی۔ مقتدیٰ الصدر اور حزب الدعوہ بھی مضبوط مرکز کے قائل تھے۔ 2007ء تک سید عبدالعزیز الحکیم کی جماعت مجلس اعلیٰ کا وفاقیت اور ایک بڑے شیعہ اقلیم کے بارے میں جوش بھی مدہم پڑ گیا۔ اب مجلس اعلیٰ نے بھی ''عراقی عوام کی رائے'' کو اپنے بیانیے کا مرکز بنالیا۔[58]واضح تھا کہ عوام کی اکثریت کے وفاقیت کو پسند نہ کرنے کی وجہ سے انہیں اپنا موقف بدلنا پڑا ہے۔

لیکن ''تجزیہ طلبی'' کی اصل بنیاد وفاقی طرز کے آئین میں استعمال ہونے والی زبان کی ساخت تھی جس کے بارے میں آیت اللہ سیستانی ہمیشہ خبردار کرتے رہے تھے۔ آئین کی شق 118 میں کہا گیا تھا کہ اگر صوبوں کی ایک سادہ اکثریت الگ اکائیاں بنانا چاہے تو انہیں اس کا حق ہو گا۔ در حقیقت آئین کی شق 112 تا 117 کی تشریح نے مستقبل میں مختلف اکائیوں کی شکل میں ممکنہ تقسیم کی ضمانت دی تھی۔

آنے والے چند سالوں میں عراقیوں میں اقالیم کی ساخت اور ان کے اختیارات، خصوصاً تیل اور سرحدوں پر تجارت کے معاملات، پر بحث ہونی تھی۔ آیت اللہ سیستانی نے جس طرح انتخابات میں جزئی بحثوں میں حصہ نہ لیا تھا اسی طرح وفاقیت کے سوال پر بھی جزئیات سے الگ رہے۔ در حقیقت جب آئین کا مسودہ تیار ہو گیا تو تمام تر مسائل کے باوجود آیت اللہ سیستانی نے اس کی مخالفت نہ کی۔ انہوں نے عراق کے تمام شہریوں سے درخواست کی کہ وہ ریفرنڈم میں آئین کے حق میں ووٹ دیں "اگرچہ کچھ خامیاں دور نہیں ہو سکی ہیں۔"[59]

15 اکتوبر 2005ء کو (ریفرنڈم کے ذریعے) آئین نافذ کر دیا گیا۔ اس وقت تک آیت اللہ سیستانی کردوں اور مجلس اعلیٰ کی سیاسی نظام میں زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کی ضد سے تنگ آ چکے تھے۔ ایک مقلد نے 15 دسمبر 2005ء میں 275 رکنی ارکان نمائندگان کے چناؤ کیلئے آنے والے انتخابات کے بارے میں سوال کیا۔ ان انتخابات میں نشستیں آبادی کے تناسب کے حساب سے تقسیم کی گئی تھیں تاکہ اہلسنت کی نمائندگی کو یقینی بنایا جا سکے۔ سنی عربوں نے جنوری 2005ء کے انتخابات میں نہایت کم ووٹ ڈالے تھے لیکن دسمبر کے انتخابات میں بہت سوں نے شرکت کی اگرچہ وفاقیت کی شقوں کے خلاف ان میں ناراضی پائی جاتی تھی۔ انہوں نے انتخابات کا بائیکاٹ اس معاہدے کی بنا پر نہیں کیا کہ پہلی پارلیمان کے ماتحت آئین پر نظرِ ثانی کیلئے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو ترامیم کی تجاویز تیار کرے گی جنہیں ایک واضح اور سادہ انداز میں اپنایا جا سکے۔ دسمبر میں سنی عربوں نے 275 میں سے 60 نشستیں جیت لیں۔

آیت اللہ سیستانی نے ایک مختصر فتویٰ دیا جس میں زور دیا کہ سب مرد اور خواتین ووٹ دیں اور انتخابات میں عوام کی "پر زور" شرکت کی امید ظاہر کی۔ انہوں نے ووٹرز کو یہ نصیحت بھی کی کہ اپنی ووٹ کو ضائع ہونے یا تقسیم ہونے سے بچائیں۔ [60] (وعلی المواطنین - رجالاً ونساءً - ان یشارکوا فیہا مشارکۃ واسعۃ

[النصوص الصادرہ، صفحہ 148])اس سیاسی رسہ کشی کے ماحول میں اس نصیحت کو ائتلاف العراقي الموحد کی ملفوف حمایت سمجھا گیا جو جنوری کی نسبت دسمبر میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہا۔ [61] ائتلاف یوں بھی اکثریت کی نمائندگی کرتا تھا، چنانچہ اس کی جیت کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ تاہم اگرچہ اس اتحاد میں مضبوط مرکز کے حق میں کچھ بلند آوازیں موجود تھیں لیکن انہیں اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ائتلاف کی حکمت عملی عراق کی تمام آوازوں کی عکاسی نہیں کرتی تھی، بلکہ صرف حزبِ اقتدار کی نمائندگی کرتی تھی، وہ افراد جو امریکی حملے سے پہلے اور بعد میں امریکی انتظامیہ سے رابطے میں تھے۔ اس رابطے نے شیعہ موقف کے بارے میں امریکیوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ شیعہ عوام وفاقیت کے قائل ہیں۔ مئی 2006ء میں امریکی سینیٹر جو بائیڈن کی طرف سے عراق کی ''سرد تقسیم'' کا منصوبہ پیش کرنے پر اس رابطے کا بھی ایک اثر ہو سکتا ہے۔ بائیڈن کے منصوبے ''ایک عراق اور تین اکائیاں'' میں مسئلہ یہ تھا کہ عراق کا آئین وفاقیت کو عراق کی حکمرانی کے ایک کلی اصول کے طور پر قبول نہیں کرتا تھا۔ کردستان کے سوا کوئی اور وفاقی اکائی بنانا عوام کی منشاء پر چھوڑ دیا گیا تھا جسے ریفرینڈم کے ذریعے متعین کیا جانا تھا۔ بائیڈن صاحب کا بیان عراقی آئین کے خلاف تھا، جو غیر ملکیوں کو عراقی ریاست کے ڈھانچے پر اثر انداز ہونے کا حق نہیں دیتا، نئی وفاقی اکائیاں عراقی عوام نے ''نچلی سطح پر'' طے کرنی ہیں۔ [62]

وفاقیت آیت اللہ سیستانی کی نظر میں عراقی آئین کے ریاست کی تقسیم کا طریقۂ کار متعین کرنے تک محدود نہ تھی۔ عراق کے حصے بخرے ہونا اس طویل تاریخ نگاری کا تسلسل ہوتا کہ جس کے مطابق عراق میں مختلف لوگوں کو اکٹھا کر دیا گیا تھا، جو ایک واحد قومی شناخت نہیں رکھتے تھے۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو عراقی ریاست کو مصنوعی بندوبست سمجھتا ہے اور آیت اللہ سیستانی اس کو کھوکھلا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اگر حقیقت آیت اللہ سیستانی کے بیانیے سے ہم آہنگ تھی اور عراقی اپنی قومی ریاست میں متحد تھے، تو آئین

ایسی مقبول تحریکوں کو ایندھن فراہم نہیں کر سکتا تھا جو عراق کو مختلف اکائیوں بانٹ دیں۔ یہاں تک کہ اگر مرکزی حکومت مفسد اور غیر مقبول بھی ہوتی، ایسا مسئلہ جس کی طرف آیت اللہ سیستانی نے نوری المالکی کی حکومت میں کئی مرتبہ توجہ کی، تو بھی وفاقی طرز کی ریاست کے مطالبے کو عوامی پذیرائی حاصل نہ ہوتی۔ سچ یہ ہے کہ زوال عراقیوں کی وطن دوستی میں نہیں آیا، بلکہ حکومت کی اس سیاست کی حمایت میں کمی آئی جو آیت اللہ سیستانی کی طرف سے کی جانے والی تاریخ کی تفسیر سے ہم آہنگ نہ تھی۔

البتہ آیت اللہ سیستانی یہ سمجھتے تھے کہ خواص عوامی امنگوں کو نظر انداز کر کے سیاست کو اپنے مفاد کے مطابق بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ریاست کے ایسے ڈھانچے پر زور دیتے تھے جس میں عوام کا سیاسی عمل میں زیادہ سے زیادہ دخل ممکن ہو سکے۔ آیت اللہ سیستانی کی نظر میں دائمی آئین میں خامیاں تھیں لیکن انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ عبوری انتظامی دستور میں سرکاری مناصب کو واضح نسلی اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے والی شقوں کو ہٹا دیا گیا تھا۔

مذہب، بالخصوص اسلام کا آئین اور ریاست میں مقام دوسرا اہم معاملہ تھا جس پر آئین کے متن پر ہونے والی بحث میں بہت اختلاف ہوا۔ تاہم آیت اللہ سیستانی کی حکمت عملی اور ترجیحات میں اس بحث کو اولویت نہیں دی گئی۔ ان کے فتوے، بیانات اور اعلانات میں مذہبی کارڈ استعمال ہوتا نظر نہیں آیا۔ لیکن قدامت پسند تنظیمیں، جیسے مجلس الاعلیٰ وغیرہ، اس سلسلے میں آئین میں خاص زبان اور ذاتی زندگی کے قوانین میں فقہ کو نمایاں کرنا چاہتی تھیں۔ یہ لوگ نہ تو حوزہ علمیہ کی نمائندگی کرتے تھے نہ ہی فقہی معاملات میں مرجع تھے۔ کئی پہلوؤں سے آیت اللہ سیستانی کا مذہبی کارڈ کھیلنے سے اجتناب کرنا چارلس ٹیلر کی رائے سے قریب ہے کہ جدید دور کے مسائل پر اسلام کی رائے ہر فرد کے نزدیک الگ ہے، اور جدت کے ساتھ یہ انفرادیت بڑھتی ہے۔ آیت اللہ سیستانی کیلئے ممکن نہ تھا کہ وہ آئین کے مذہبی پہلوؤں پر ایسی رائے دیں جو سب شیعہ اہلِ نظر کی نمائندگی کا حق ادا کر سکے، نہ ہی ان پر ایسا کرنے کی ذمہ داری تھی کیوں کہ وہ حوزہ

علمیہ کے سربراہ تھے۔ تاہم ان کا عکس العمل مذہب سے بالکل لاتعلق اور مکمل سیکولر ریاست کے حق میں بھی نہیں تھا۔ ایسا کرنا ان کی اسلام کو معاشرے کی اخلاقی بنیاد کے طور پر باقی رکھنے کی ذمہ داری کے خلاف جاتا۔ اس آئینی بحث میں آیت اللہ سیستانی کا مطمع نظر اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ اکثریت کی قومی شناخت جمہوری اصولوں سے ہم آہنگ اور محفوظ رہے۔

آئین میں اسلامی دفعات کے معاملے نے امریکی اور دوسرے مغربی صحافیوں اور پالیسی سازوں میں بہت ابہام پیدا کیا۔ شیعہ مراجع اور ان کے ''شرعی قوانین پر مبنی آئین'' کو لاگو کرنے کے عزائم کے بارے میں قیاس آرائیاں 2003ء سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ جنوری 2005ء کے انتخابات کے بعد اس سوال پر کہ اسلام کے بارے میں نظریہ پردازی کی شکل کیا ہوگی، بعض اوقات قرائن کی طرف اشارہ کئے بغیر بھی بحث جاری رہی۔[63] کچھ محققین نے کہا کہ ''آیت اللہ سیستانی اور دوسرے مراجع مذہبیت کو عراقی آئین کا حصہ بنانے پر سارا زور صرف کر دیں گے۔'' یہ سمجھا جا رہا تھا کہ ''وہ اگر ہر بات میں مداخلت نہیں کر رہے تو وہ مناسب موقع کی تلاش میں ہیں۔''[64] تاہم یہ مباحث مستقل آئین کی تدوین سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں۔

سب سے زیادہ تحفظات آئین کی دوسری دفعہ کے بارے میں تھے، جو یہ ہے:

اول: اسلام ریاست کا سرکاری مذہب ہے اور قانون کا بنیادی مأخذ ہے۔

(ا) کوئی قانون جو اسلام کے مسلم اصولوں کے خلاف ہو، نہیں بن سکتا۔

(ب) جمہوریت کے اصولوں کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکتا۔

(ج) کوئی ایسا قانون جو اس آئین میں بیان کئے گئے بنیادی حقوق اور آزادیوں کے منافی ہو، نہیں بنایا جا سکتا۔

دوم: یہ آئین عراقی عوام کی اکثریت کے اسلامی تشخص کی ضمانت دیتا ہے اور سب شہریوں کے مذہبی حقوق کے تحفظ اور عقیدے و عمل کی آزادی یقینی بناتا ہے۔۔۔۔[65]

یہ زبان نہ صرف مبہم تھی، بلکہ بعض مبصرین کیلئے یہ تضادات پر مبنی تھی کیوں کہ یہ روز مرہ کی حکمرانی کے لئے کوئی رہنما اصول فراہم نہیں کرتی تھی نہ ہی عدالتوں کو مقدمات کے فیصلے میں کوئی مدد دیتی تھی۔ بہر حال اس کا مقصد ایسی کوئی واضح رہنمائی فراہم کرنا تھا ہی نہیں۔ باقی عرب ممالک کے دساتیر اور عراق کے سابقہ آئین کی مشابہ دفعات کی طرح ان دفعات نے اسلام کے ریاستی مذہب ہونے کا رسمی اعلان کیا، جو مذہب اور ثقافت کے احترام کا اظہار تھا۔ دوسرے عرب ممالک میں بھی ان باتوں پر آئینی مباحث ہوئی تھیں کہ آیا اسلام قوانین کا ایک مأخذ ہے یا اسلام ہی قوانین کا واحد مأخذ ہے؟ مثال کے طور پر مصر میں 1972ء میں آئین کی دوسری شق میں ''اسلامی فقہ کے اصول قانون سازی کا ایک ذریعہ ہیں'' کی جگہ ترمیم کر کے یہ لکھا گیا کہ ''اسلامی فقہ کے اصول قانون سازی کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔'' جناب ناتھن براؤن، مشرق وسطیٰ کے دساتیر کے ماہر، نے احتمال ظاہر کیا تھا کہ یہ ترمیم حکومت کی طرف سے مذہبی کارڈ کو استعمال کرنے کیلئے کی گئی تھی۔ اگرچہ یہ ترمیم اس وقت کی گئی جب مصر کا سپریم کورٹ (محکمۃ الدستوریۃ العلیا) اپنی آزاد حیثیت برقرار کر چکا تھا اور شریعت کی اپنی تشریح نافذ کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ البتہ براؤن کا کہنا ہے کہ سپریم کورٹ نے اس ترمیم کو مصر کے آئین کی حدود واضح کرنے کیلئے استعمال نہیں کیا۔ اس کے بعد آنے والے فیصلوں سے پتا چلا کہ فقہ کو ایک مستقل قانون کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔[66]

اگر یہ مثال اور علاقے کے دوسرے دساتیر کی ایسی مثالیں کوئی اشارہ دیتی ہیں تو یہ ہے کہ عراقی آئین کی پہلی اور دوسری دفعات میں استعمال ہونے والی زبان اپنی اصل میں کوئی تشویش ناک چیز نہیں ہے۔ [67] اسے سمجھنے کیلئے ہمیں عدالتوں کے مجموعی کردار اور علاقے میں مذہب کی بنیاد پر سیاست کرنے

والوں کو سمجھنا ہو گا، جو یہاں ''شیعہ تنظیمیں'' ہیں جیسے مجلس اعلیٰ کے کارکنان جنھوں نے آئین کا مسودہ تیار کرنے میں حصہ لیا۔ آئین کے کچھ نقاد چاہتے تھے کہ اس میں کوئی ابہام اور تضاد نہیں ہونا چاہیئے اور کچھ صنفی تاثر والے جملوں، جیسے ''ہم نے آدمؑ کے بیٹوں کو فضیلت دی'' پر بھی اعتراض ہوا کہ اس میں بیٹوں کے ساتھ بیٹیاں کیوں نہیں ہیں۔ محقق شاک ہانیش نے لکھا کہ آئین کی وہ دفعات جن میں انسانی حقوق کے احترام جیسے اصولوں کا ذکر ہے نا قابل عمل ہوں گی اگر انہیں فقہ کے تابع رہنے والی شق کا پابند بنایا جائے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ مسلمانوں کی سب مذہبی تبلیغ، حقوق اور مساوات کے جدید تصورات کے برعکس ہے۔ ان کے تجزیئے کے مطابق یہ دستاویز قدیم فقہ کی تائید کرنے کی وجہ سے ''قدامت پسندانہ اور حتیٰ رد عمل کی نفسیات کا عکس'' تھی۔ ہانیش صاحب کے خیال میں تاریخ میں اسلامی حکومتوں کے طرز عمل کی روشنی میں یہ ابہام ''حریت اور جمہوریت کے تصور کی جدید تشریح کی مخالفت'' کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ ہانیش صاحب کا تجزیہ آئین کی سطر بہ سطر نقد پر مشتمل تھا تا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ آئینی دفعات مبہم اور متضاد ہیں۔ انہوں نے یہ بھی ثابت کرنا چاہا کہ آئین کلی طور پر انسانی حقوق اور معاشرے میں خواتین کے کردار کے معاملے میں عقب ماندگی کی طرف ایک قدم تھا۔ ان کے مطابق اس کا سبب وہ رکاوٹیں اور پابندیاں تھیں جو اسلام کے نام پر قوانین کی تشریح پر لگا دی گئی تھیں۔ لیکن ہانیش صاحب اور کچھ دوسرے دانشوروں کا تجزیہ مذہبی لوگوں کی شمولیت کے اہداف کے بارے میں قیاس آرائیوں اور طاقت حاصل کرنے کے بعد ان کے رویّے میں تبدیلی آجانے کی پیش بینی جیسے اوہام پر کھڑا ہے۔ [68]

دستاویز کو مبہم کے بجائے لچکدار کہنا زیادہ مفید ہے، جیسا کہ محقق حیدر حمودی صاحب نے کہا ہے۔ ان کے مطابق متن کی زبان جان بوجھ کر انتخاب کی گئی تھی تا کہ آئین میں ارتقاء اور وقت کے مطابق بہتری آنے کی گنجائش رکھی جا سکے۔ آئین کو لچکدار ہونا چاہیئے تا کہ وہ سیاسی رجحانات سے بالاتر ہو اور جوں جوں ریاست کے قدم جمتے جائیں، اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو۔ [69] حیدر حمودی صاحب کے مطابق آئین کی کچھ تشریحات میں غلطی وہاں پر ہے جہاں ''آئینی اور دستوری تبدیلی کا جامد اور رسمی تصور''

اپنایا گیا، جس کے مطابق آئین میں تبدیلی صرف تحریری ترمیم کے ذریعے آتی ہے۔ حمودی صاحب نے امریکی آئین کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ قانون دانوں نے آئین کی تشریح کے مسلسل ارتقاء کا تصور دیا ہے: سماجی اور سیاسی تبدیلی ناگزیر ہے، اور نئے اور پرانے سیاسی بندوبست میں تبدیلی کے ساتھ چلنے کیلئے آئین کی زبان لچک دار ہونی چاہئیے۔ اگر حمودی صاحب کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ آئین سب سیاسی رجحانات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مل کر چلنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اسے سیاسی ثقافت اور ''عوامی مقبولیت'' کا دھیان رکھنا ہے جو آیت اللہ سیستانی نے کرشماتی طور پر عوام کو ووٹ دینے پر آمادہ کر کے تخلیق کی تھی۔ مثال کے طور پر برقعے پر پابندی کی قرارداد نہایت غیر مقبول ہو گی۔ چنانچہ حمودی صاحب کہتے ہیں کہ یہ زبان مکالمے کی ایسی فضا فراہم کرتی ہے جو مباحث کو عراق کی مقبول آوازوں سے ہم آہنگ کر سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ سوچنا چاہئیے کہ اگر مسودہ لچکدار نہ ہوتا تو ایسی صورت میں کیا ہوتا؟ اول تو اس میں ہر انتخابات کے بعد ترامیم ہوتی رہتیں، دوسرے ریاست میں مذہب کے مقام کے تعین کے بارے میں مستقل تعطل جاری رہتا۔

حمودی صاحب کی آئینی فہم ہمیں آیت اللہ سیستانی کی طرف سے آئین کی تیاری اور اس میں مذہب کے کردار پر خاموش رہنے کی حکمت سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ آیت اللہ سیستانی نے دفعات تجویز نہ کر کے آئین کی جزئیات میں مداخلت کرنے سے پرہیز کیا لیکن اس کلی قاعدے کو واضح انداز میں بیان کیا کہ میثاق میں اسلامی اصولوں کو شامل کیا جائے۔ حمودی صاحب نے ہی 2009ء میں مراجع سے ملاقاتوں کے بعد ان کے بیانیے کو ''نجف منترا'' کا نام دیا جس سے مراد اقتدار کی سیاست میں حصہ لئے بنا شہریوں کی رہنمائی کا عزم تھا۔ چنانچہ یہ قابلِ فہم تھا کہ آیت اللہ سیستانی سیاسی عمل کی کلیات کے بارے میں تو متعدد فتاویٰ جاری کر کے اپنے سیاسی موقف کی وضاحت کریں لیکن ''سیاسی عمل کی جزئیات'' میں مداخلت نہ کریں۔

ریاست میں مذہب کے کردار کے بارے میں آیت اللہ سیستانی کے فتاویٰ کو اکٹھا کر کے ہم اس موضوع پر ان کے موقف کو سمجھ سکتے ہیں، جو اس عمل کے آغاز سے پہلے بھی دیئے جا چکے تھے۔ 2003ء میں انہوں نے ایک ایسے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ حکومت جو ''اکثریت کی مرضی'' سے منتخب ہو گی اسے اکثریت کے مذہب کا احترام کرنا ہی ہو گا اور وہ ''عوام کی لگائی گئی قیود کے خلاف نہیں کرے گی۔'' اگلا سوال عراق کو درپیش سب سے بڑے خطرے کے بارے میں تھا، آیت اللہ سیستانی نے کہا ''اس کی ثقافتی شناخت، جو اسلام کے ارکان میں سے ہے، کے مٹ جانے کا خطرہ۔'' [70][النصوص الصادرہ، صفحہ 33] دوسرے سوالات میں آیت اللہ سیستانی سے پوچھا گیا تھا کہ کیا حکومت ایرانی طرز کی ہو گی اور کیا یہ ''اسلامی خلافت'' ہو گی؟ انہوں نے کہا کہ ایرانی طرز کی حکومتِ فقیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن انہوں نے واضح کیا کہ حکومت کو ''اسلام کا احترام'' کرنا ہو گا کیوں کہ یہ اکثریت کا مذہب ہے۔ [71] (اما تشکیل حکومۃ دینیۃ علی اساس فکرۃ ولایۃ الفقیہ المطلقۃ فلیس وارداً [النصوص الصادرہ، صفحہ 47]) اسی فتوے میں انہوں نے کہا کہ حکومت کو اسلامی تعلیمات کے منافی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ کوئی نظامِ حکومت مسلط نہیں کر سکتے اور اس کا فیصلہ عوامی آراء کی روشنی میں ہو گا جو عام انتخابات کے ذریعے ظاہر ہوں گی۔ ان کے نزدیک ان کی ذمہ داری ''ان (عوامی آراء کے اظہار) کیلئے راستہ ہموار کرنا'' ہے۔ [72][النصوص الصادرہ، صفحہ 71، 72] آیت اللہ سیستانی مذہب کے کردار کو معاشرے کی اخلاقی بنیاد کے طور پر دیکھ رہے تھے لیکن یہ بتانے سے گریز کر رہے تھے کہ اس میں کیا کچھ شامل ہے۔

2003ء میں مجوزہ مجلس قانون ساز کے بارے میں ان کے فتوے کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ قابض قوت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انتخابات کرائے بغیر اراکین کو تعینات کرے۔ لیکن اس میں اس تشویش کا اظہار بھی شامل تھا کہ یہ دستور عراق کی ''قومی شناخت'' کا مظہر نہیں ہو گا، جسے آیت اللہ سیستانی

''مذہب کا اہم رکن اور مقدس سماجی قدر'' قرار دیتے تھے۔[73][النصوص الصادرہ، صفحہ 35،36] ان سے سوال کیا گیا کہ وہ اسلامی فقہ کے کن نکات کو آئین کے حصے کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آئین میں ''دینی عقائد، اخلاقی اصول اور سماجی اقدار بنیادی ستون ہونے چاہئیں۔''[74][النصوص الصادرہ، صفحہ 55] مستقبل کے آئین میں مذہب کے کردار کے بارے میں ایک بے لاگ سوال نے آیت اللہ سیستانی سے یہ جواب پایا کہ تفصیلات طے کرنا منتخب اسمبلی کے اراکین کا کام ہے۔[75][النصوص الصادرہ، صفحہ 78] وہ اکثر اس بات کا اضافہ کرتے تھے کہ ''اسلام عراقی عوام کی اکثریت کا مذہب ہے۔اگر آئین کی تدوین عراقیوں کے منتخب کردہ افراد کے ہاتھوں ہوگی تو یہ اسلامی اقدار اور اعتدال پسندی کا مظہر ہوگا۔''[76][النصوص الصادرہ، صفحہ 79،80]

اگرچہ وہ مذہب کے کردار کے بارے میں رائے دیتے تھے لیکن اس کے ساتھ اس ضمانت کا اضافہ کرکے تعادل پیدا کرتے کہ آزاد اور شفاف انتخابات اس مسئلے پر عراقی رائے عامہ کو آشکار کریں گے۔آیت اللہ سیستانی نے اس بات کا اضافہ بھی کیا کہ آئین کو مفاہمت، تکثریت، دوسروں کی رائے کا احترام اور مساوات جیسے اصولوں کا بھی خیال رکھنا چاہئیے۔آیت اللہ سیستانی نے ریاست کی نوع کے بارے میں اپنے تصور پر 12 فروری 2004ء میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے زور دیا کہ نظامِ حکومت کا فیصلہ جمہور کی رائے پر چھوڑنا چاہئیے۔انہوں نے اضافہ کیا کہ جو لوگ اس عمل میں ذمہ داریاں اٹھائیں انہیں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنانا چاہئیے اور تکثریت، بیلٹ باکس کے احترام،اور پر امن منتقلیٔ اقتدار کے ساتھ ساتھ انصاف اور مساوات کے اصولوں پر متفق ہونا چاہئیے۔ [77][النصوص الصادرہ، صفحہ 55،56]

انہوں نے اپنے مقلدین کو یقین دلایا کہ عراق کی ''اصلی سیاسی اور سماجی قوتیں'' ملاراج کے نفاذ کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کے بجائے وہ ایسی حکومت کے قیام کے داعی تھے جو عراقیوں کی اکثریت کے ''مذہبی عقائد کا احترام'' کرتی ہو۔ [78] [النصوص الصادرہ، صفحہ 96تا99] یہ ایک ایسی سیکولر حکومت کی حمایت تھی جو اسلام سے رہنمائی لیتی ہو اور معاشرے میں اس کے ثقافتی کردار کا تحفظ کرتی ہو۔

اپنے شروع کے بیانات میں جس چیز کی طرف آیت اللہ سیستانی کی توجہ نہیں تھی وہ یہ تھی کہ عراقی گورننگ کونسل اور عبوری انتظامی دستور آگے چل کر آئین نویسی کے عمل کی سیاسی حرکیات کا تعین کریں گے۔ انہوں نے ایسے عمل کا تصور پیش کیا تھا جو آبادی کی زیادہ بہتر نمائندگی کر سکے۔

آیت اللہ سیستانی کے فتاویٰ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی شرائط پر جمہوریت کی بنیاد رکھنے کیلئے پر عزم تھے۔ ان کے فتاویٰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیعہ اکثریت کو باقی آبادی کی قیمت پر مضبوط نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک مذہبی ریاست نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ ریاست میں تحول کے دوران عراقی ''ثقافتی شناخت'' نہ ''کھو'' بیٹھیں۔ ہم ماضی میں جا کر تاریخ میں آیت اللہ سیستانی کے کردار کا نمونہ 1906ء میں ایران میں آنے والے جمہوری انقلاب کے دوران اس وقت کے شیعہ مراجع کے جمہوریت کی حمایت کرنے میں دیکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ محقق جناب بابک رحیمی نے کہا ہے، آیت اللہ سیستانی کو اس روایت کا امین سمجھنا چاہئیے جس میں مرجع عوام کی رہنمائی کر کے اسلامی اقدار کی ترویج کے ذریعے حکومت اور عوام کے درمیان ایک سماجی معاہدہ قائم کرتا ہے۔ [79] تاہم اس سے زیادہ بھی ہو رہا تھا۔ آیت اللہ سیستانی کا حقوق اور آزادیوں کے احترام کا تصور جس دور میں تشکیل پایا تھا وہ ان کے پیشروؤں کے زمانے سے مختلف تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے اقدامات ماضی کے مراجع کے فتاویٰ کو مد نظر رکھ کر اٹھائے گئے تھے۔ لیکن ان کا خود ارادیت کا تصور جدید خیالات کی روشنی میں بنا تھا، جیسا کہ ان کا اقوام متحدہ کے فیصلوں کی پابندی کرنے اور اس (بین الاقوامی حسبیہ کے) ادارے اور اس کی

دستاویزات کی طرف رجوع سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہر حال یہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کی اکیسویں شق ہی تھی جس میں واضح انداز میں کہا گیا تھا کہ سب لوگوں کو اپنے ملک کی حکمرانی میں حصہ لینے اور اپنے نمائندوں کو آزادی سے منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔[80] اقوام متحدہ کے التزام نے آیت اللہ سیستانی کی بہت مدد کی۔ آیت اللہ سیستانی بار بار اقوام متحدہ کا حوالہ دیتے۔ اور اقوام متحدہ نے جواب میں عراق کے سرنوشت ساز مراحل میں ان کو ہی واحد موثر آواز کے طور پر قبول کر لیا۔

آیت اللہ سیستانی کے نظریۂ جمہوریت میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ ثقافتی سندیت کے گرد قائم تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بہت سے اسلامی رہنماؤں کی سوچ جناب مارک جیر گنزمیر کے قریب تھی جو مذہب کو قوم سازی اور ریاست سازی کے عمل کی سیاسی مقبولیت کیلئے مفید نظام الاعتقاد سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو ایک جدید اور مقبول طریقۂ اظہار کے طور پر لیا ہے جو جدید قومی ریاستوں پر مشتمل سیاسی منظر نامے میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ قدیم مذہبی روایت اور سیکولر قوم سازی کا امتزاج تھا جو آیت اللہ سیستانی کی صورت میں سامنے آیا، جو مارک جیر گنزمیر صاحب کے تجزیئے کے مطابق جدید قومی ریاستوں میں جمہوری اقدار اور انسانی حقوق کی تقویت کا سبب بن سکتا ہے۔[81] جب آیت اللہ سیستانی اسلام کے احترام کی بات کرتے ہیں اور حکومت کو ''اسلامی اصولوں کی مخالفت نہ کرنے'' کی نصیحت کرتے ہیں [82][النصوص الصادرہ، صفحہ 47] تو کچھ محققین اسکو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن آئینی عمل میں لچک کے مفہوم کی طرف توجہ دینے سے آیت اللہ سیستانی کی اسلام اور جمہوری سوچ میں گہرا تعلق پیدا کرنے کی خواہش کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ریاست سازی کا عمل جنگ عظیم اول کے بعد عالمی طاقتوں کی سرپرستی میں شروع ہوا جس میں جنگ عظیم دوم کے دوران مزید مداخلت ہوئی۔ قیادت، آئین کی تدوین اور پارلیمانی عمل میں برطانیہ اور فرانس اس سے پہلے کردار ادا کر

چکے تھے۔ آیت اللہ سیستانی کی کوشش یہ تھی کہ نو آبادیاتی دور کے اسلوب کو دہرایا نہ جائے، چنانچہ انہوں نے اپنے نظریۂ جمہوریت کو عراق کی مقامی بنیادوں پر تعمیر کیا۔